U 33002 . Date - 30-12-07

Title - JAALE ; GYARAH AFSANON KA MAJMUA.

Creator - Shamsher Singh Narula.

Publisher - Saagi Book Dipo (Delhi).

Date - 1943.

Pages - 160

Subjects - Urdu Adab - Afsane.

گیارہ افسانوں کا مجموعہ
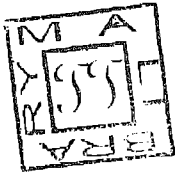
Ram Babu Saksena Collection.

دائمی حقِ اشاعت بحقِ ساقی بک ڈپو دہلی محفوظ

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے ————— طبع اوّل

محبوب المطابع برقی پریس دہلی

Maulana Azad Library Aligarh
۳۳۰۰۲
ALIGARH
14 SEP 1963
CHECKED-2002

ہندوستانی ادیبوں کی خستہ حالی کے نام

M.A.LIBRARY, A.M.U.
U33002

۲۵۵۹۹

فہرست مضامین

پیش لفظ

اُردو افسانہ نگاری میں ایک ساتھ بہت سے اچھے لکھنے والوں کا معرضِ وجود میں آجانا محض ایک نباتاتی عمل نہیں بلکہ یہ دورِ حاضرہ کی عالمگیر بے اطمینانی، اقدار کے تنزل اور دوسری اقتصادی ضروریات کا اقتضا ہے۔ اور یہ نئی پود رات کو مٹی کے تیل کے ساتھ اپنے جسم کی فاسفورس جلاتی ہے اور اپنے جامد ماحول کو دیکھ کر خود کڑھتی ہے اور دوسروں کو کُڑھاتی ہے ———

"۔۔۔اس نے اپنے دائیں بازو کو آہستہ سے اوپر اٹھایا اور درمیانی انگلی سے اپنی بھووں کو کھجانے لگا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ گنگنایا۔ "ہندوستان میں کون بیمار نہیں؟ بہن! یہ بیماری تو زندگی کی نشانی ہے زندگی کی نشانی، جب دم ہی نہ ہو تو بیماری کیا خاک ہوگی" اس کے بعد وہ کھوکھلی، مذاق سے خالی ہنسی میں ہچکولے کھانے لگا۔"

(دو اسٹیشنوں کے درمیان)

اقتصادی بدحالی، اس پر رسم و رواج کے بندھن جسمانی اور روحانی بیماریوں سے رہائی کی امید موہوم نے مصنف میں کس قدر تلخی کے نشتر پیدا کر دیئے ہیں اور وہ بیماری کو ہی زندگی کی نشانی سمجھنے لگا ہے۔ بہ سبیلِ تذکرہ ایک پُرخلوص دوست کی ایک بات یاد آتی ہے۔ وہ اپنی تمام تلخی کے ساتھ اپنے ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہا

تھا۔ ہماری زندگی میں کوئی بھی جنبش نہیں۔ کاش ہمارے ملک کی گلیوں میں بم گریں تاکہ لوگوں میں کچھ حرکت پیدا ہو۔ لیکن "جالے" کا مصنف بالکل قنوطی ہے۔ اور اس کا یہ خیال کسی حد تک مستحکم ہوتا چلا جاتا ہے کہ ایک ہندوستانی ـــــــ موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں۔ غلامی کے جال سے مرکر ہی نجات حاصل کرسکتا ہے۔ (مکڑی کا جالا) اور اگر کوئی آدمی، مصنف خود ہو یا گنوبتیا کا سیتل جب (گرام) سُدھا کا کام ہاتھ میں لے بھی تو وہ اپنا سر پھوڑ کر رہ جاتا ہے۔ بھوک، عفونت اور تصویر کا سیاہ رُخ پیش کرنے کا طرز عمل جو مصنف نے اختیار کیا ہے نہ داماں اس بات کا خواہاں ہے، کہ لوگوں کو جھنجوڑا جائے۔ مصنف کی رسائی (*Approach*) منفی ہے۔ اپنے آپ کو بے کیفی، بیماری سے وابستہ کرتی ہے "ایک ہندوستانی کی پیدائش" جو کہ مصنف کے افسانوں میں ممتاز درجہ رکھتا ہے اس کی بہترین مثال ہے۔ ایک ہندی جس عجیب صحت مند ماحول میں جنم لیتا ہے ایسا ہے ـــــــ

"دینے کو اس کوٹھڑی (زچہ خانہ) میں محبوس ہوئے یہ ساٹھواں سال تھا۔ اور یہ چارپائی، دریاں، لحاف تب بھی ویسے ہی تھے جیسے کہ اب۔ اس عرصے میں اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ اسے چھپن دفعہ روشن کیا جا چکا تھا۔ چھپن عورتوں نے اس کی جھپکتی ہوئی آنکھوں کے سامنے ننھے ہندوستانی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ چھ تو اسی کوشش میں کام آئیں، چار اس اذیت کو آخر تک نہ سہار سکیں۔ اور ایک لحاف میں چھپے ہوئے بچھو کے کاٹنے سے مر گئی۔ تین بچے مرے ہوئے پیدا ہوئے۔ آٹھ بچے پیدا ہونے کے چند دن بعد مر گئے۔ اور جب اس کو گل کرنے کے تھوڑا عرصہ پہلے ماں بچے کو باہر نکالا جاتا تو وہ سوچا کرتا کہ یہ نیم جان زندگیاں باہر جاکر کیا زیادہ دیر جلتی ہوں گی؟"

اور شمشیر سنگھ کے افسانے اس قسم کے مقدس نفرت جگانے والے منظروں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان میں "گئو ہتیا" "مکڑی کا جالا" "بیج اور پھل" "ہسپتال میں" قابلِ ذکر ہیں۔ جیسے اس نئی پود کے لکھنے والوں کے وجود ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں اسی طرح ان کے سوچنے کے طور و طریق میں بھی امتیازی شان نظر آتی ہے۔ ان میں سے کوئی انسان اور اس کی وساطت سے اشیا کو جانچتا ہے تو دوسرا اشیا اور حالات کے ذریعے انسان کا مطالعہ کرتا ہے۔ کوئی کردار کی انفرادیت پیش کر کے تصویر مکمل کرتا ہے تو کوئی ماحول کی بے رحم عکاسی سے نقوشِ حقیقت اُجاگر کرتا ہے۔ شاید ان سب میں توازن برقرار رکھنے والے کو اتمامی حیثیت دی جا سکے۔ لیکن اس وقت ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ اور اتمامی حیثیت ہے بھی ایک اضافی بات . . . . . اُردو افسانہ نگاری کے اس عبوری دَور میں افراط و تفریط دونوں ہیں۔ جیسا کہ نئے ادب میں جنس کے بارے میں نمایاں ہے۔ لیکن کیا صرف یہی کافی نہیں کہ سب ایک رُزا فزوں ترقی کے ساتھ منزل کی طرف گامزن ہیں۔ اور نہیں تو کسی جہدی روزگار کیلئے راہ بنا رہے ہیں۔

پہلی چیز حُسنِ انتخاب ہے اور شمشیر سنگھ نرولا کے منتخبہ مضامین میں کوئی بھی عامیانہ پہلو لئے ہوئے نہیں۔ محبت کی مثلث و مسدس اس کے ذہن میں نہیں سماتی۔ آخر جو شخص کسی لفظ کے وسیع معانی (Fourth Dimensional) دیکھ لیتا ہے وہ فوراً اس بات کا اندازہ لگا لیتا ہے کہ مکڑی کا جالا ایک علامت ہے ایسی دُنیا کی جس میں بالخصوص ہندوستانی جنم لیتا ہے اور موت ہی اس کیلئے واحد ذریعہ نجات ہے۔ اذیت سہتی ہوئی گائے کو زہر دیکر مارنا گئو ہتیا نہیں بلکہ اسے بھوکوں رکھ کر نفس بہ نفس اذیت سے مارنا گئو ہتیا ہے۔ "عورت اور حُسن، چار دن کی چاندنی، ٹمٹماتی ہوئی قندیل، میں مصنف کو کچھ کہنا ہے اور بات ہر جگہ کہنے کے لائق ہے اور مصنف کے

حسنِ انتخاب کی داد چاہتی ہے۔

ہمارے پاس خام مواد اس کثرت سے ہے لیکن اس کا کون حصہ استعمال کیا جائے اس کیلئے ایک تجربہ پسند آنکھ کی ضرورت ہے۔ دوسرے لفظوں میں انتخاب سے زیادہ ضروری ردّ ہے۔ جہاں ہمیں اس بات کا تقاضا ہے کہ افسانہ نگار کو علمی و عملی دسترس ہو وہاں اس بات کی ضرورت بھی ہے کہ وہ بہت سی پڑھی لکھی چیزوں کو بھول سکے۔ اور نہ صرف ایک آزاد روش اختیار کرے بلکہ بہت سی باتوں کو ان کی ذاتی خوبصورتی کی بنا پر افسانہ میں جگہ دینے سے گریز کرے۔ کیونکہ اس طرح ایک خاص حصہ نمایاں ہو کر باقی سب حصوں پر حاوی ہو جائیگا۔ اور مجموعی تاثیر کو قائم نہیں رہنے دیگا۔ اگرچہ شمشیر سنگھ نرولا کا رجحان (Synthetic) ہے لیکن وہ صرف انہی چیزوں کو بروئے کار لاتے ہیں جن کا اُن کے نفسِ مضمون سے تعلق ہے اور پھر سب کچھ اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ وہ مختلف حصوں کے ایک مضمون کی بجائے ایک ہی مضمون کے مختلف حصے دکھائی دیتے ہیں۔

لیکن شمشیر سنگھ کی انفرادیت، اُن کی خوبی ان کی عکس ریز آنکھیں ہیں جو ذیلی جزئیات کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔ معمولی سے معمولی جنبش، بے بضاعت ترین شئے کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ اور بعض اوقات تو ایسی جگہ بھی پہونچ جاتی ہیں جہاں ان کے افسانے کے کردار کا گذر نہیں ہوتا۔ ہم پڑھتے ہیں تو بعض وقت جھنجلا اُٹھتے ہیں۔ آخر کون ہے جو پوسٹ مارٹم کئے ہوئے جسم میں شریانوں اور وریدوں کا ایک بہت بڑا حصہ دیکھ کر شانے نہیں جھٹکتا۔ لیکن جب تک ہم منظر و پس منظر اور اس سے وابستہ تمام جزئیات سے آگاہ نہیں ہوتے ہمیں کسی عضو کے تعطّل کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں شمشیر سنگھ پوری عقل و ہنر کے ساتھ نبّاضی کرتا ہے۔ اور پھر ہمیں جسم کے مُردہ ہونے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ اور ہم یقین کرنے

لگتے ہیں کہ اس جسم میں روح بھی ہے۔

لاھور　　　　　　　　　　　　　　　راجندر سنگھ بیدی

سخنہائے گفتنی

اپنی کہانیوں کے پہلے مجموعے کو میں بلا پس و پیش کئے شائقین ادب کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ ہمارے نئے ادب پر عریانی و فحش نگاری غالب آرہی ہے۔ ان کہانیوں میں اس تسلّط کے خلاف بغاوت کی گئی ہے عشق و محبّت کے پامال راستے سے الگ ہوکر ایک نیا راہِ عمل اختیار کیا گیا ہے۔

اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عورت اور نفس ہماری زندگی کے اہم اور ضروری جزو ہیں لیکن ادب زندگی کی غلامانہ ترجمانی نہیں، نہ ہی ادیب کا نصب العین زندگی کو عوام کی سطح تک لانا ہے۔ بلکہ اسے اپنی بصیرت کے مطابق اوروں کو صحیح زندگی کا نمونہ دکھانا چاہیئے۔ اظہار اور بیان کی حد بندی کے باوجود وہ حقیقت کی تخلیق بھی کرتا ہے اور اس طرح زندگی کے نئے معیار اور نئی اقدار قائم ہوتی ہیں۔ ادیب زندگی کے تمام تر امکانات موازنہ کرکے انسان کو بلند اور مکمل حیات کی جھلک دکھاتا ہے۔ اس کی آنکھیں اوروں کی آنکھوں کے مقابلہ میں زیادہ حقیقت شناس ہوتی ہیں۔ اس کے کان زیادہ چوکنّے، اس کی حسّیات زیادہ جامع اور تیز تر، اسے تخیل کے ذریعے ساوی حقائق تک رسائی حاصل کرنی ہوتی ہے۔ تاکہ وہ نسلِ انسانی کیلئے نیکی اور فضیلت کی راہ تلاش کرسکے۔ چنانچہ حقیقت نگاری برائے حقیقت نگاری بے حد لغو سی ہے۔ اور زندگی کی غلامانہ آئینہ داری کرنے والا ادب لازمی طور پر گھٹیا قسم کا ادب ہے۔ ہندوستانی ترقی پسند ادب

کا یہ مقصد نہ ہونا چاہئے۔ قدیم یونان میں ادب کا یہ مقصد فضیلت کی تبلیغ تھا یہی وجہ ہے کہ وہ ادب آج تک نسلِ انسانی کیلئے مشعلِ رہبری کا کام دے رہا ہے۔ رفتہ رفتہ اس مسلک کو رد کر دیا گیا حتیٰ کہ برائے حیات کے بہانے ادب کو بے لباس کر کے بدر رو میں گھسیٹا جا رہا ہے۔ مزید براں یہ ادبی حقیقت یا ماہیت تو بہت بلند خیال ہے۔ انسان کیلئے حیاتِ اعلیٰ کی ضرورت صرف اخلاق پرستی سے پوری نہیں ہو سکتی۔ اس کیلئے حُسن اور سچائی بھی ناگزیر ہے۔ ادبی ماہیت بھی سچائی اور حسن ان تینوں سے وسیع تر اور بلند تر تخیل ہے۔ اس کا جلوہ حاصل کرنا ادیب کی سعی و کاوش کا نکتہ آغاز ہونا چاہئے۔

جدید ہندوستانی ادب بنیادی طور پر تفریحی ہے۔ بہت ترقی پسند ہو جانے پر یہ کسی حد تک تعمیری بن جاتا ہے۔ ہندوستان کی روح بیمار و مختل ہے۔ اسے حیات بخش ادب کی ضرورت ہے۔ ادب جو ملک کے قدامت پسندانہ نظریات کو سراسر بدل ڈالے ہمارے ترقی پسند ادب میں اسی مقصد کا فقدان ہے۔ ان ادیبوں کو ہندوستانی زندگی کے بنیادی مسائل پر بحث کرنی چاہئے تھی۔ اس کا حل پیش کرنا تھا۔ لیکن یہ ترقی پسندی محض نفسی تجزیہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ وہ عوام میں عریاں کہانیوں کیلئے رذیل بھوک کی دُکان داری کر رہے ہیں اور مختلف نعروں کے ذریعے اس کی عظمت کے راگ الاپ رہے ہیں۔

حقیقتاً مروجہ ترقی پسند ادب نئے رنگ میں پیش کردہ رجعت پسند ادب ہے موضوع وہی عشق، محبت، عورت ہے، صرف طرزِ تحریر نیا ہے۔ آنکھ مچولی اب موٹر لاریوں میں، کارخانوں کے سایہ تلے، مزدوروں چماروں کے محلوں میں، لیبر یکسوں کی اوٹ میں ہونی شروع ہو گئی ہے۔ ہندوستانی ذہن پر پہلے ہی نفس بہت حاوی تھا۔ اس کی آئینہ داری کے بہانے یہ نام نہاد ترقی پسند ادیب اس آتشِ شوق کو اور

بھی تیز کر رہے ہیں۔ لہٰذا یہ ادب عوام کیلئے نئی قسم کی مگر بے حد مہلک افیون کی صورت اختیار کر رہا ہے۔ انھیں زندگی کی تلخیوں کو فراموش کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔ جدید زندگی بے حد بوقلموں ہے لیکن تھکے ماندے مزدور، خمیدہ کمر کلرک، جاہل یا نیم تعلیم یافتہ نوجوان سب میں نفس مشترک ہے۔ اس "ہمہ گیر" ادب نے نفس کو موضوع سخن بنا کر سب کی لذت و تفریح کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ اس کی مقبولیت بلند معیار کی گواہی نہیں اور نہ ہی اس کے ادنیٰ معیار کے عوام ذمہ دار ہیں۔ جیسے کہ چیخوف نے لکھا ہے "ادب کے معیار کی پستی کیلئے عوام کو ملزم نہیں ٹھیرایا جا سکتا۔ وہ ہمیشہ سے کم فہم اور بے ذوق تھے۔ گلّہ کو گڈریئے اور محافظ کتوں کی ضرورت لاحق رہی ہے۔ وہ وہی راہ پکڑتے ہیں جدھر گلّہ بان جاتا ہے" ہندوستانی ادیب عوام کی رہبری کرنے کی بجائے ان کی ادنیٰ لذتوں سے ذہنی تحریک حاصل کر رہے ہیں۔ وہ مشعل کو بجائے آگے لے جانے کے قافلہ کے پیچھے لے جا رہے ہیں۔ جارج ڈوہمل نے سینما کو "عوام کے ذہن کو کند اور اکارت بنانے کی بے رحم مشین" اور سینما دیکھنا "غلاموں اور ضعیف العقل انسانوں کا شغل" بیان کیا ہے۔ ایک اور امریکی مفکر نے لکھا ہے کہ عام فلمیں پست ذہن کیلئے تفریح بہم ہی نہیں پہنچاتیں یہ ذہن کو پست بنانے کا ذریعہ بھی ہیں۔ اگر ہمارا ترقی پسند ادب اسی رفتار سے ترقی کرتا رہا تو وہ دن دور نہیں جبکہ اس کے متعلق ہمیں اسی تعریف کا اطلاق کرنا پڑے گا۔

برنارڈ شا نے اپنے ڈرامے "پیورٹنوں کیلئے تین کھیل" میں لکھا ہے "میں چیلنج کرتا ہوں کوئی ثابت کرے کہ فنون لطیفہ کے دور سازوں کی برتری فنی استادی یا ہنر مندی کی وجہ سے تھی۔ یہ لاثانی جگہ اوّلین طور پر انھیں زندگی کے متعلق رفیع نظریے کے باعث حاصل ہوئی" ہمارے ترقی پسند ادیبوں کو بھی رفیع نظریۂ حیات قائم کرنا ہوگا۔ انھیں اپنی ادبی کاوشیں زندگی کی تخلیق و تجزیہ کے فلسفے پر تعمیر کرنی ہوں گی۔ تب ہی

وہ ہندوستان کیلئے صحت مند ادب پیدا کر سکیں گے۔ انھیں ادب کا عوام کی بنیادی جذّو جہد سے رشتہ پیدا کرنا ہوگا۔ اور ان کیلئے بالکل نئے غیر ممکن نہیں ممکن مسلک تلاش کرنے ہوں گے۔ اس کے حصول کیلئے انھیں لازمی طور پر اپنے ذہن کو ہوس اور نفس کے آسیب سے آزاد کرنا ہوگا۔ مگر یہ ان کے بس کی بات معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہوس ان کے ذہن کی بیماری ہے۔ جیسے وہ اسی طرح حسب مرضی ترک نہیں کر سکتے جیسے گٹھیا کا مریض اپنا درد نہیں چھوڑ سکتا۔ خیر جیسا بھی وہ لکھ سکتے ہیں لکھیں ہمیں مطلق اعتراض نہیں۔ لیکن جب وہ عریانی اور فحش نگاری ہی کو موضوعِ ادب قرار دیتے ہیں تو ہم صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں +

شملہ
۲۳- فروری ۱۹۴۳ء

شمشیر سنگھ نرولا

مکڑی کا جالا

پھٹے پھٹے برسے ہوئے بادلوں میں لپٹی ہوئی سیلن اور کیچڑ میں تر، سردی سے ٹھٹھرتی، شروع ماگھ کی ایک سہ پہر شام کی طرف رینگے جا رہی تھی۔ سرد برفانی ہوا کی تند پھونکیں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔

ایک زیر تعمیر قطعہ زمین کے کونہ میں گھن کھائے بانسوں پر کھڑی گھاس پھوس نرسل اور سرکنڈے کی شکستہ جھونپڑی ان ہوا کے جھکڑوں میں ڈگمگا رہی تھی۔ اس کی لاتعداد جھرّیوں اور درزوں میں سے سردی سے لرزتی اور بھوک سے لڑکھڑاتی ہوئی غربت اپنے اردگرد اونچے عالی شان مکانات میں سکونت پذیر خوش حالی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔

اس جھونپڑے میں ایک مزدورن گابھ سے پھولی ہوئی چیتھڑوں کی بنی اوڑھنی اوڑھے زچگی کے درد سے جسم توڑ رہی تھی۔ جاڑے کی شدت اور کئی روز کی نیم فاقہ

کیشی نے اس اذیت کو ناقابلِ برداشت بنا رکھا تھا۔ پل پل بعد دل ہلا دینے والی چیخیں مارتی اور لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی۔ اس کا زرد بھیانک چہرہ اس انتہائی درد و بے چینی کا آئینہ دار تھا۔ اس کے سوجے ہوئے نچلے ہونٹ سے لعاب بہہ کر اس کی بے وضع میلی ٹھوڑی اور موٹی گردن کو تر کر رہا تھا۔ مزدورن کے قریب ہی اس کی چھوٹی لڑکی نمو پڑی ہوئی تھی، جس کے سوکھے میلے نیم مردہ جسم میں دو مشتعل متحرک آنکھیں ہی زندگی کی واحد نشانی تھیں۔ جھونپڑی کی دوسری طرف مزدورن کی ساس رکی ٹانگیں پیٹ میں سکیڑے سردی سے گٹھڑی بنی اوندھی لیٹی ہوئی تھی۔ مزدورن کا سب سے بڑا لڑکا لالو بازار میں مزدوری کرنے گیا ہوا تھا۔ اور اس سے چھوٹی دُلاری سات سال کی لڑکی ایندھن کیلئے مال گودام سے لکڑیاں چُرا لے گئی ہوئی تھی۔ مزدورن کی یہ پانچویں زچگی تھی۔

مزدورن کا خاوند مزدوری سے جلدی واپس آ گیا۔ اسی قطعۂ زمین میں زیرِ تعمیر عمارت پر کام کر رہا تھا۔ اور اپنی بیوی کی درد بھری چیخیں سُن کر اسے کام کرنا ناممکن ہو رہا تھا۔ جھونپڑی کے قریب آ کر اس نے مزدورن کو مدھم شفقت آمیز لہجے میں آواز دی

"کیسی ہو چنڈی؟"

چنڈی دردِ زہ سے تڑپ رہی تھی۔ اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا، دُکھ بھری آنکھوں سے موتی کی طرف دیکھا۔ اور مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کی ٹھوڑی کانپنے لگی۔ نیچے لٹک گئی۔ اور ادا اس ہنسی اس کے زرد بے رونق ہونٹوں ہی میں رک گئی۔

موتی، چنڈی کے قریب آ بیٹھا اور اس کے اندر دھنسے ہوئے رخساروں کو تھپکنے لگا۔ چنڈی نے بھی اپنے کھردرے میلے لمبے لمبے ناخنوں والے ہاتھوں کو موتی کے بازوؤں پہ ڈال دیا۔

"آج بھی کہیں سے پیسے ملے یا نہیں؟" چنڈی نے زیرِ لب پوچھا اور جواب کا انتظار

کئے بغیر منہ دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ موتی کی مایوس آنکھوں سے اسے نفی میں جواب مل چکا تھا۔

ٹھیکیدار نے پچھلے دو ہفتوں سے مزدوری نہیں دی تھی اور ان کے پاس پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے کچھ بھی نہیں تھا۔

"منشی جی سے ہی کچھ مانگ لیا ہوتا"، چنڈی نے پُردرد آواز میں کہا۔ "اماں کو بھی سُندر لال کی دکان سے آٹا دال کچھ نہیں ملا۔"

"منشی بھی تو قصائی ہی کا کتّا ہے"، موتی مایوس اور بے بس لہجے میں بڑبڑایا اور اس کا گلا بھر آیا۔

موتی ذرا پیچھے ہٹ کر آٹے کے خالی پیپے کا سہارا لیکر بیٹھ گیا۔ اور سامنے لٹکی ہوئی رسّی کو گھورنے لگا جو مکھّیاں بیٹھنے سے کالی ہو گئی تھی۔ جھونپڑی اتنی غلیظ اور گرد آلود تھی کہ انتہائی سردی کے باوجود مکھّیاں بھنبھنا رہی تھیں اور چھت مکڑی کے جالوں سے اَٹی ہوئی تھی۔ کافی دیر خاموشی کا بہرہ کرنے والا شور اس کے کانوں میں سائں سائں کرتا رہا۔ ایک بھیانک بے حسی اس کا مغز چاٹ رہی تھی۔ صرف چنڈی کی چیخیں اور رَتی کی کھانسی کبھی کبھی اس خاموشی میں مخل ہو رہی تھی۔

رَتی نے اپنا چہرہ ان کی طرف گھمایا۔ ایک ناقابلِ بیان بھوک سب کے پیٹوں کو کُرید رہی تھی۔

اسی عرصے میں دُلاری بھی واپس آگئی۔ بھوک سے اس کی انتڑیاں باہر نکل رہی تھیں، مال گودام تک کہاں جاتی۔ جو تھوڑے سے کاغذ لائی تھی کونے میں رکھ کر سہمی سہمی دادی کے قریب جا بیٹھی اور نزدیک پڑے ہوئے مٹکے پر سر ٹکا کر ماں کی طرف ترس بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

چنڈی کبھی آنکھیں کھولتی کبھی بند کرتی۔ اسے ہر صورت میں اندھیرا ہی دکھائی دے

رہا تھا۔ وہ بڑی بے صبری سے آنے والی ڈراونی گھڑیوں کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی کی آہنی گرفت اس کی جان باہر نکالنے کی کوشش کر رہی ہے۔

موتی خالی پیپا گھسیٹ کر جنڈی کے پاس آ بیٹھا۔ کام کی تھکاوٹ کی وجہ سے اس کی ہڈیاں درد کر رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر آج پھر اس کے پیٹ میں کچھ نہ گیا تو کل کام کیسے ہوگا۔ رگی کے پھولے ہوئے اندھے ڈھیلے بھوک سے باہر نکل رہے تھے۔ دلاری کی ننھی جان بھی بھوک سے کلبلا رہی تھی۔ جنڈی کے قریب لیٹی ہوئی ننھو سب کی طرف باری باری دیکھ کر کچھ کھانے کو مانگ رہی تھی۔ ایک مہیب خاموشی سب کے دل و دماغ پر مسلط تھی۔ سب لالو کے کچھ کما لانے پر امیدیں لگائے ہوئے تھے۔

"پانی پانی . . . . پانی" جنڈی پھڑپھڑاتے خشک ہونٹوں میں بڑبڑائی۔

"خالی کلیجے پانی مت دینا" رگی اپنے آپ کو تھامتا ہوا چلایا "بڑا نازک وقت ہے۔ دو جانوں کا معاملہ ہے" اس کی آواز بلغم سے اٹی ہوئی چھاتی سے بہ مشکل نکل رہی تھی۔

موتی خاموش رہا۔ اور اپنی بے بٹن کرتی سے جھانکتے کالے خشک بالوں کو کھجانے لگا۔ اسے حجامت بنوائے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ اس کی دانتوں سے کاٹ اور چبا کر چھوٹی کی ہوئی ڈاڑھی مونچھیں لاتعداد چیونٹے اور چیونٹیوں کی طرح نظر آ رہی تھیں جو اس کے نتھنوں میں گھسے جا رہی تھیں۔ ایک اجنبی ملامت اس کی نسوں میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ اسے اپنی غربت پر غصہ کی بجائے اپنے آپ سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ غربت کی گود میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا بچپن فاقہ کشی کے ہنڈولے میں جھولا تھا۔ لڑکپن کلفت اور

فلاکت سے کھیل کر گذار رہا تھا۔ دُکھ اور غم اس کی زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔ لیکن اب پہلی دفعہ اس زبوں حالی پر ملامت اس کی رگ رگ میں سوزش پیدا کر رہی تھی اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی اس کا خون باہر نکال رہا ہے۔

"پانی ... ہائے پانی .... میں مری" چنڈی نے پھر التجا کی اور کمزوری اور سردی سے لرزنے لگی۔

"خالی کلیجے پانی مت دینا" رکی نے پھر کھانستے ہوئے کہا "اگر کچھ ہو گیا تو کون سنبھالے گا۔ کھانڈ نمک ہی چٹا دو"

"پانی لاؤ۔ میں مٹی ہی چاٹ لیتی ہوں" چنڈی اپنے گرد آلود ہاتھ چاٹنے اور دانتوں کا میل کُرید کر چُوسنے لگی۔ اس کی کڑوی خشک زبان میں پیاس سے کانٹے چُبھ رہے تھے۔

بائیں طرف ایک مکان کا باورچی خانہ تھا۔ دُلاری کو وہاں کا باورچی سہ پہر کی چار کی بچی کھچی چیزیں باہر پھینکتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ چپکے سے اٹھ کر وہاں گئی اور سلیب امرود کے تراشے کیلے کے چھلکے۔ آدھ کھائے توسٹ مٹھائی وغیرہ اٹھا لائی اور چنڈی کو کھانے کیلئے دیا۔ موتی نے کونے میں پڑی ہوئی گرد آلود صراحی سے پانی ایک آبخورے میں اُنڈیل کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ رکی بھی کیلے کا چھلکا لیکر اندر سے چاٹنے لگی ــــــ!

سامنے والے مکان کے نیچے ایک سادھو کھڑا بھیک مانگ رہا تھا۔ ایک خوش پوش عورت نے مکان سے نکل کر آٹا اس کے جھولے میں ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر موتی کے دل میں بھی امید کروٹیں لینی بیدار ہوئی۔ اور اس نے دُلاری کو وہاں جا کر آٹا مانگنے کیلئے اشارہ کیا۔ دُلاری اپنی کمزور کانپتی ٹانگوں کو جلدی جلدی حرکت دیتی ہوئی اس عورت کے پیچھے پیچھے مکان کے اندر چلی گئی۔ اور جھجکتے جھجکتے آٹے کا سوال کرنے لگی۔ اس عورت نے

دُلاری کو حقارت اور غصہ بھری آنکھوں سے گھور کر دیکھا اور ڈانٹ ڈپٹ کر باہر نکال دیا۔

جب دُلاری اس مکان سے نا امید ہو کر باہر نکلی تو ساتھ والے مکان کے سنگِ مرمری دروازہ پر کھڑی ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہاتھوں میں باسی روٹیاں لئے تھوڑے سے فاصلے پر کھڑی گائے کو پچکار کر روٹیاں کھلانے کیلئے بُلا رہی تھی۔ دُلاری بھوک سے بیکل، سردی سے بے بس لڑکھڑاتی کانپتی خود بخود اس عورت کی طرف بڑھی، اور روٹیاں لینے کیلئے اضطراراً اس کے ہاتھ اوپر اُٹھ گئے۔

''پرے ہٹ چڑیل رنڈی کہیں کی'' اس عورت نے دُلاری کو ڈانٹا اور گائے کو پھر پچکارنے لگی۔ گائے اپنی گردن ہلاتی ہوئی آگے بڑھی اور عورت نے بڑے پیار سے روٹیاں اس کے بیڈھب جبڑوں میں ٹھونس دیں۔

دُلاری کی برہنہ ٹانگیں سردی سے لکڑی کی طرح سخت ہو گئی تھیں۔ وہ روٹیوں کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑی تھی۔ ناقابلِ ضبط بھوک اس کے دل میں ایک بے معنی آرزو بیدار کر رہی تھی۔ یکا یک اس نے اپنے کمزور ہاتھوں سے گائے کے جبڑوں میں سے روٹیاں چھیننے کی کوشش کی۔ اس عورت نے دُلاری کو اس کے گھسے پھٹے کُرتہ سے پیچھے کھینچا۔ کُرتہ بالکل چاک ہو گیا۔ وہ کیچڑ بھری زمین پر گر پڑی اور چوٹ کھا کر بلکنے لگی۔ درد سے گھٹے ہوئے حلق سے نکلتی ہوئی چیخوں کو روکنے کیلئے وہ اپنے کانپتے لبوں کو کاٹنے لگی۔ اس کے دانت بج رہے تھے۔ رگڑ سے چھلی ہوئی ٹھوڑی اور ناک سے خون کی چند بوندیں پھوٹ پڑیں اور عورت کو گھورنے لگیں۔ گائے نے بھی روٹیاں کو جگالی کرنا بند کر دیا۔ اور اپنی آنکھوں سے دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔

موتی یہ سب کچھ دیکھ کر غصّے سے جل رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ جس تنکے کو سہارے کیلئے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو وہ مچھلی

کی طرح ہاتھ سے پھسلتا جا رہا ہے۔ اس کا سر لٹو کی طرح چکرا رہا تھا۔ یکایک اِرد گرد کے اونچے اونچے مکانات اسے جھولے کی طرح حرکت کرتے دکھائی دینے لگے۔

اسی مکان سے ایک موٹا توندل چقندر جیسے لال رخساروں والا متوسط عمر کا آدمی نکلا۔ دُلاری سے ایسے بچ کر گذرا جیسے وہ پلیگ کی چوہیا ہو۔ اور ساتھ والے مکان کی بیٹھک میں تاش کھیلتے ہوئے آدمیوں سے باتیں کرنے لگا۔ اتنے میں اس کا نوکر اس کے کتے کُتیا کو سیر کروا کر واپس آگیا۔ موٹا آدمی کتے کُتیا کو جیک، نورا کہہ کہہ کر پیار کرنے پچکارنے اور تھپکنے لگا۔ اور بعد میں نوکر کو ڈانٹتے ہوئے بولا "بیوقوف! سیر کروانے میں اتنی دیر لگا دیتے ہو۔ جاؤ جلدی جیک کو گوشت کھلاؤ اور نورا کو دودھ پلاؤ۔"

گوشت اور دودھ کے الفاظ قریب ہی پڑی ہوئی دُلاری کے کانوں میں گونجنے لگے۔ موٹے آدمی نے اپنے اوورکوٹ کی بیرونی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اندرونی جیب میں سنبھال کر رکھ لی اور آگے کو چلا گیا۔

دُلاری سڑک سے آہستہ آہستہ اٹھ کر جھونپڑی میں آئی۔ چنڈی اور رکی جنھیں بڑھتی ہوئی سردی نے نیم بیہوش کر دیا تھا اوندھی پڑی ہائے ہائے کئے جا رہی تھیں۔ چنڈی کا بالائی ہونٹ زور زور سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ اس کا بے خون چہرہ زرد سے زرد تر ہوتا جا رہا تھا اور وہ بمشکل سانس لے رہی تھی۔

"لالو آ گئے ہو کیا؟" رکی نے دُلاری کے قریب بیٹھنے کی آواز سے ہوش سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ مگر کسی نے جواب نہ دیا۔

موتی نے سر باہر نکال کر آسمان کی طرف دیکھا۔ بیباک شام سائیں سائیں کر رہی تھی۔ گھونسلوں کی طرف اڑتے پرندوں، آوارہ بدلیوں اور آزاد ہواؤں کو دیکھ کر اس کا دائمی غربت میں جکڑا ہوا دل للچانے لگا اور بے معنی ہوس و تمنا اس کے ذہن میں تڑپنے لگی۔

لاّلو لڑکھڑاتا ڈگمگاتا جھونپڑی میں داخل ہوا۔ سب کی آنکھیں اس کی طرف اٹھ گئیں اور اس کی مدھم غمگین آنکھوں سے اپنے سوال کا جواب پا کر نیچے جھک گئیں۔ رِلّی بھی سب کی خاموشی کا مطلب تاڑ گئی۔ دو تین پیسے میں نوجوان، زیادہ بوجھ اٹھانے والے مزدور مل جاتے تھے اس لئے لاّلو کو بہت دفعہ مزدوری نہیں ملتی تھی۔ جس امید پر ان کا حوصلہ قائم تھا وہ اب ٹوٹ چکی تھی۔ یکایک سب کا غم اور دکھ اس حد تک پہونچ گیا جہاں حواس سُن ہو جاتے ہیں۔ اور رونا بھول جاتا ہے۔ موتی کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا۔ ایک گہرا خوفناک ڈر اس کے جسم میں سرایت کئے جا رہا تھا۔ چنڈی نے دو تین چیخوں سے اپنے بڑھتے ہوئے درد کا اظہار کیا۔ دُلاری نے ذرا آگے بڑھ کر اپنا سوکھا مریل سر ماں کے جسم پر لٹکا دیا۔ اس کے پھٹے ہوئے کرتے سے جھانکتی بھوکی پسلیاں موتی کو اپنے سینے میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایک ناقابلِ برداشت بھوک سب کے جسموں کو بے رحمی سے چبائے جا رہی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" رلّی کھانستی ہوئی کراہی "ایسے کب تک جئیں گے..... ہم کو تو بھوکا مرنا ہی ہے۔ کل نہ سہی آج سہی لیکن چنڈی کا تو خیال کرو۔ گر ٹھکی شکر نہیں اسے سوکھی روٹی تو ملنی چاہیئے" چند لمحات کی خاموشی کے بعد رلّی پھر بڑبڑائی "تم سے ہزار دفعہ کہا ہے دُلاری ہی کو فروخت کر دو۔ تارو بابا ہی کو دیدو۔ بوڑھا ہے تو کیا پیسے تو کھرے دیتا ہے۔ وہاں جا کر دو وقت پیٹ بھر کر روٹی تو کھائیگی"

موتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک گہری مایوسی اس کے چہرہ کو ڈراؤنا بنا رہی تھی۔ اس کے اعضا زور زور سے کپکپا رہے تھے۔ اس کی ہڈیوں سے جلن پھوٹ رہی تھی۔ اس نے سوچنے کی کوشش کی لیکن اس کا دماغ ناقابلِ فہم کشمکش میں الجھا ہوا تھا۔ اس کے پپوٹے تیزی سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ بے بس ہو کر بار بار گرنے لگا۔ چنڈی نے اپنی آنکھیں کھولیں اور ترچھی مدہوش نظروں سے موتی کو دیکھنے کی کوشش

کرنے لگی۔ بالآخر اس کی نظریں موتی کی متاسف پریشان آنکھوں پر جم گئیں۔ اس کے پتلے زرد ہونٹ آپس میں ایسے جُڑ چکے تھے جیسے سلے ہوتے ہیں اور اس کے بے رونق چہرے پر نیلی دھاریاں نمودار ہو رہی تھیں۔

یکایک موتی اُٹھ کھڑا ہوا۔ گدلے، کڑوے خیالات اس کے طوفان زدہ دماغ میں بے بس کشتی کی طرح ڈگمگا رہے تھے۔ اس کا دل بیٹھتا جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں بے اختیار کانپ رہے تھے۔ اس کی ہر حرکت ایک تلخ غصے کے اثرات کا اظہار کر رہی تھی۔ وہ اپنی لرزتی ٹانگوں کو سنبھالے ہوئے جھونپڑے سے باہر نکل گیا۔ اور سامنے مکان کی بیٹھک کے قریب پہونچ کر اندر آتش دان کے ارد گرد بیٹھے تاش میں مشغول آدمیوں سے چند پیسے قرض مانگنے لگا۔ سب کی حقارت بھری آنکھیں اس کی طرف اُٹھ گئیں، اور ان میں سے ایک نے خشک کرخت لہجہ میں کہا "معاف کرو!"

موتی نے خالی بے معنی طریقے سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کے ہوش و حواس جواب دے چکے تھے۔ اس کا سینہ پھول رہا تھا۔ اسے اپنے ارد گرد کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بلّور کی طرح منجمد و بے حس ہو چکی تھیں۔ وہ غصے سے اپنے دانت پیسنے لگا۔

سڑک کے دوسرے سرے پر بھیک مانگنے والے کمبل پوش فقیر کی آواز اس کے کانوں میں پڑی اور بے سوچے سمجھے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اسے اپنے قدموں کی آواز سے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کے ہاتھی سے وزنی پاؤں بڑی مشکل سے اٹھ رہے تھے وہ لڑکھڑانے لگا اور بے حس ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس نیم بیہوشی کی حالت میں وہ رینگتا، اُٹھتا بیٹھتا، لڑکھڑاتا بلا ارادہ طور پر جھونپڑے میں واپس لوٹا اور چنڈی کے قریب ہی چت لیٹ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اس چند گز کی گہری خندق کو عبور کرنے میں کئی صدیاں لگیں، جس عرصے میں اس کے ناتواں جسم کو طرح طرح کی اذیتیں سہنی پڑیں۔ اسے

اس نیم خوابیدہ حالت میں ایسا معلوم ہونے لگا کہ ایک مریل دُبلا پتلا بھوکا گھوڑا ایک ایسے بگّے کو کھینچنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے جس میں درجنوں آدمی بیٹھے ہوئے ہیں جو بے رُکے اس گھوڑے کے کان، ناک، آنکھوں اور گردن پر چابک مارے جا رہے ہیں اور سونٹے سے اس کی کمر کو پیٹے جا رہے ہیں۔ یکایک اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنی زندگی کے لئے کسی قوی ہیکل جیسے سے گتھم گتھا ہو رہا ہے۔ اور ارد گرد کھڑے عالی شان محلات اس کی اس کش مکش کو اس اشتیاق اور مسرّت سے دیکھ رہے ہیں جیسے ننھے ننھے بچے سانپ اور نیولے کی لڑائی کو دیکھتے ہیں۔

اتنے عرصے میں چنڈی کی ایک مزدور سہیلی بھی اسے دیکھنے آگئی۔ زچگی کو بالکل قریب دیکھکر وہیں ٹھہر گئی۔ اور چنڈی کے سردی سے کانپتے بے حس جسم کو اپنے ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر گرم کرنے لگی۔ اس آواز سے موتی بھی اپنی نیم غنودگی سے بیدار ہوا۔

شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سردی سے کانپتی قدرت کالے کمبل کو اوپر اوڑھتی معلوم دے رہی تھی۔ تیز برچھیوں سے لدی ہوئی برفانی ہوا جسم کو چیر رہی تھی۔ موتی اٹھ کر چنڈی کے ذرا اور قریب ہو بیٹھا۔ ارد گرد مکانوں کے اوپر ڈوبتے سورج کی سُرخی اُسے مرتے دن کی خون آلود لاش کی طرح نظر آ رہی تھی۔ دفعتہً موت اسے بڑی پیاری محسوس ہونے لگی اور موت کے تخیل سے وہ بیٹھے بیٹھے ذائقے کا لطف لینے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ خدا نے اس کے اور مسرّت و سکون کے درمیان اتنی وسیع خلیج کیوں بنا رکھی ہے۔ اور موت اسے ایک آسمانی پری معلوم ہو رہی تھی جس کی مدد سے وہ اس خلیج کو عبور کرنا چاہتا تھا۔

چنڈی کا درد اس وقت بہت بڑھ چکا تھا۔ اگرچہ بھوک اور کمزوری نے اس کی چیخوں کو ذرا مدھم کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پتّے کی طرح کانپ رہے تھے۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں جو درد کی وجہ سے اور بھی پھیل گئی تھیں اس کے چھوٹے بھولے چہرے

کو بہت ڈرا دنا بنا رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں سے جھاگ اُبھر رہا تھا۔ ایک بے رحم درد اس کے جسم کو کُتر رہا تھا۔ طرح طرح کے ڈراؤنے خیالات اس کے مدہوش دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ایک چنڈی نہیں بلکہ بہت سی چنڈیاں تھیں جو آپس میں زندہ رہنے کیلئے کشمکش کر رہی تھیں۔ سڑک پر بجلی کے قمقمے اسے اپنی نشست میں بیٹھے ہوئے جن بھوتوں کے گھورتے دیدے نظر آ رہے تھے۔ سرد ہوا کا ایک جھونکا چلا اور اس کے بالوں کی گرد آلودہ لٹیں اس کے غمگین رخساروں کو چوم کر اظہار ہمدردی کرنے لگیں۔

چنڈی کے منہ سے اُبلتے جھاگ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ موتی انہیں ہاتھ سے اڑانے لگا۔ ایک مکھی چنڈی کے سر پر لٹکی ہوئی مکڑی کے جالے میں جا پھنسی اور رہائی کے لئے کشمکش کرنے لگی۔ چنڈی کی سرد آنکھیں موٹے موٹے بے پلک پپوٹوں سے اس زندگی کیلئے جد و جہد کرنیوالی مکھی کو تاڑنے لگیں۔

یکایک چنڈی نے اپنے قلب میں حرکت محسوس کی، کچھ ہلتا، پھڑکتا۔ اس پر ایک نا قابلِ بیان لرزش طاری تھی۔ اس نے بیٹھنے کی پُر درد مگر ناکام کوشش کی۔ اسے ایسا معلوم دے رہا تھا جیسے وہ وہاں برسوں سے لیٹی ہوئی ہے۔ اس کے سوجے ہوئے ڈیلے خولوں سے باہر گرتے معلوم دے رہے تھے۔ اس کے رُخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں سرخ تر ہوتی جا رہی تھیں۔ پسینے کے چند قطرے اس کی پیشانی پر چمک رہے تھے اور اس کے جسم سے عرق پھوٹ رہا تھا۔

چنڈی کی سہیلی نے نیم مُردہ منّو کو اٹھا کر رکی کے قریب لٹا دیا۔ اس نے دُلاری، لالو اور موتی کو چنڈی کے بازو پکڑ کر پیٹھ کے سہارے لٹانے کیلئے کہا اور خود اس کے گھٹنے پکڑ کر علیحدہ علیحدہ کر کے جسم کے اندر کی طرف جھکا دیئے۔ چنڈی کے بازو پھڑپھڑا رہے تھے اور وہ انھیں موتی، لالو اور دُلاری کے نرم اور لرزتے ہاتھوں سے چھڑانے کی بہت کوشش

کر رہی تھی۔ اس کی ناک سے پانی بہہ رہا تھا، منہ سے جھاگ نکل رہے تھے۔ آنکھیں پتھرائی جا رہی تھیں۔ اور وہ بے بسی سے جسم مروڑتی لوٹ پوٹ ہوئے جا رہی تھی۔ درد کی اندوہ ناک کیکپی اور موت جیسے لرزے نے اس کی صورت کو ڈائنوں کا سا رنگ دے دیا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیانک غصے سے سب کو گھور رہی تھیں۔ درد کی شدّت کی وجہ سے اسے اپنے ننگے جسم پر ہوا کی تیز برچھیاں بھی محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔

چند لمحات میں چنڈی کی سہیلی کے ہاتھوں میں چند سوکھی بے ماس ہڈیوں کا ایک ننھا بے خون بچہ تھا۔ موتی نے ناخنوں سے اس کا نال کاٹا اور پیار و ہمدردی سے اُٹھتی آنکھوں سے چنڈی کی طرف دیکھنے لگا۔ چنڈی کی مایوس آنکھیں بیگانہ پھیکے پن سے اسے گھورنے لگیں۔ اس کے کانپتے ہونٹوں نے کچھ حرکت کی جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن ان سے کوئی آواز نہ نکلی۔ اس کے حلق سے سانس بمشکل نکل رہا تھا۔ موتی پر کٹھی ایک دردناک سراسیمگی غالب تھی۔

"مبارک ہو چنڈی . . . . لڑکا ہے!" چنڈی کی سہیلی نے ہمدردانہ لہجے میں رُکتے ہوئے کہا۔

چنڈی خاموش رہی۔ اس کی ٹمٹماتی آنکھیں مکڑی کے جالے میں آزادی کیلئے آخری کشمکش کرتی مکھی پر جمی ہوئی تھیں۔

نومولود بچّے نے جھونپڑے کے باہر بے کنارہ اندھیرا دیکھا۔ اور زور زور سے رونے لگا۔

چنڈی مسکرائی۔ ایک درد میں بھیگی ہوئی مسکراہٹ۔ اس نے اپنی مشتعل آنکھوں کو اِدھر اُدھر گھمایا۔ سر جھٹکا۔ ایک دو ہچکیاں لیں اور دم توڑ دیا۔

مکڑی کے جالے میں پھنسی ہوئی مکھی بھی آزاد ہو چکی تھی +

ایک ہندوستانی کی پیدائش

تقریباً ہر ہندوستانی مکان میں اگر وہ مکان خود ہی اندھیری کوٹھڑی نہ ہو تو ایک غلیظ اندھیری کوٹھڑی ضرور ہوتی ہے جسے ہندوستان کے نئے شہریوں کی پیدائش کیلئے متعین کیا ہوتا ہے یا جسے بچوں کے ڈرانے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک ایسی ہی کوٹھڑی کے گرد بھرے طاقچے میں پڑے ہوئے پرانے مٹی اور کالک میں لپٹے ہوئے دیئے کی چند روزہ زندگی کو پھر روشن کر دیا گیا۔ دیئے کی کانپتی پھڑپھڑاتی لو جھپکتی ہوئی آنکھوں سے کوٹھڑی میں اِدھر اُدھر جھانک کر واقف و مانوس چیزوں کی تلاش کرنے لگی۔ اسی طرح بوڑھی شکستہ چارپائی کوٹھڑی کے متعفن بھیانک اندھیرے سے ڈری سہمی کسی معصوم ابلا کی طرح دیوار سے چمٹی ہوئی تھی۔ اور گرد کی پوشش میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسی طرح خوف زدہ مغموم لحاف، دریاں اور چیتھڑے جنہیں ہر زچگی کے موقع پر استعمال کیا جاتا تھا اس کی ٹانگوں سے چمٹ رہے تھے۔

دیئے کو اس کوٹھڑی میں محبوس ہوتے یہ ساٹھواں سال تھا۔ اور یہ چارپائی، دریاں، لحاف تب بھی ویسے ہی تھے جیسے کہ اب۔ اس عرصے میں اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کو چھپن دفعہ روشن کیا جا چکا تھا۔ چھپن عورتوں نے اس کی جھپکتی ہوئی آنکھوں کے سامنے نئے ہندوستانی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ چھ تو اسی کوشش میں کام آئیں۔ چار اس اذیت کو آخر تک سہار نہ سکیں اور ایک لحاف میں چھپے ہوئے بچھو کے کاٹنے سے مر گئی۔ تین بچے مرے ہوئے ہی پیدا ہوئے۔ آٹھ بچے پیدا ہونے کے چند دن بعد مر گئے اور جب کبھی اس کوٹھڑی کو ترک کرنے کے تھوڑا عرصہ پہلے ماں اور بچے کو باہر نکالا جاتا تو وہ سوچا کرتا کہ یہ نیم جان زندگیاں باہر جا کر کیا زیادہ دیر جیتی ہوں گی؟

دیا روشن کرنے کے بعد شیاما نے چارپائی کو زمین پر بچھا دیا۔ اس پر قریب پڑی ہوئی پرانی گرد اور خون کے دھبوں سے بھری ہوئی دریاں بچھا دیں اور پھر اپنی سوتن لیلا کو لا کر اس پر لٹا دیا۔ کوٹھڑی کی گھٹن اور جیٹھ کے دوپہر کی گرمی کے باوجود اس نے لحاف کو لیلا پر ڈال دیا۔ اس کے زرد اور بھیانک چہرے پر کالی کڑی لے جیبی اپنے گھناؤنے پر پھیلا رہی تھی۔ ایک ناقابلِ ضبط تھرتھری اس کی ہڈیوں کو ہچکولے دے رہی تھی — زچگی کے موقع کو قریب جان کر شیاما نے لالہ جی کو جلدی دائی کو ساتھ لانے کے لئے کہلا بھیجا۔

لیلا، لالہ رادھے شیام کی تیسری بیوی تھی اور شیاما پہلی۔ لالہ جی کی پہلی شادی ہوئے چودہ سال بیت چکے تھے، اس سے صرف ایک لڑکی ہی پیدا ہوئی تھی جو اب بارہ برس کی تھی۔ اس کے بعد کوئی اور بال بچہ پیدا نہیں ہوا۔ بہت جنتر منتر کئے۔ پانچ سال تک ہر اماوس کو رودری کا پاٹھ اور کئی دفعہ ایک سوا ایک دن تک گوپال سنتان منتر کا سمپٹ پاٹھ کروایا اور بہت سے منتروں کا جاپ کروایا۔ کئی سادھو سنتوں کی سیوا کی۔ گنگا بھگتی سنتوں کی پوجا کی، ان کے چرن دھو کر پیئے۔ اور چوری چوری ان کے کپڑے کتر کر جلا کر کھلائے تاکہ

ان کی بجائے وہ خود خوش قسمت ہو جائے۔ اور بالآخر وہ کرواچوتھ کی رات کو پرسوت میں مری ہوئی ایک عورت کی چتا پر جا کر ناچی نہائی۔ لیکن پچھلے جنم کے کھوٹے کرموں کا پھل! اتنا کچھ کرنے پر بھی اس کی گود ہری نہ ہوئی۔

لالہ رادھے شیام کو پتر ضرور چاہیے تھا۔ اس کے بغیر ان کی مکتی ہونی ناممکن تھی۔ مرنے کے بعد ان کی کھوپڑی کو توڑ کر ان کی آتما کو آزاد کرنے کیلئے اور اس کے بعد مختلف مواقع پر مختلف چیزیں براہمنوں کو دان کر کے اگلے جنم میں ان تک پہنچانے کیلئے بیٹے کا ہونا ضروری تھا۔ وہ دن رات یہی سوچتا رہتا۔ ہر وقت گھر میں غم اور تشویش کا اندھیرا چھایا رہتا۔ بیٹا تو گھر کا دیا ہوتا ہے۔ اس کے بغیر اجالا ہو ہی کیسے سکتا ہے۔

آخر لالہ جی نے دوسری شادی کر لی۔ سودا سستے داموں ہو گیا۔ لڑکی والوں کی طرف سے بھی شادی کا تمام خرچ کرنے کی صرف ایک شرط تھی جس پر ڈیڑھ سو سے زائد خرچ نہ آیا۔ لڑکی کی عمر دس سال تھی۔ شاردا ایکٹ کی گرفت سے بچنے کیلئے شادی قریبی کی ریاست رام پور میں ہوئی۔ اور لالہ جی نئی بیوی اور نئی جوانی لیکر گھر لوٹ آئے۔

نئی بیوی کی تھیں کچی بالک ہڈیاں اور لالہ جی کا بھاری بھرکم جسم۔ پہلی رات ہی جب وہ سیج چڑھی تو لالہ جی کے نام تک سے ڈرنے لگی۔ جب اپنے پتی دیوتا کی شکل دیکھتی تو کانپنے اور رونے لگتی۔ ڈری سہمی اِدھر اُدھر دوڑتی چھپتی پھرتی۔ لالہ جی اس کے پیچھے بھاگتے انھیں اپنی مکتی کے لئے جلدی سے جلدی بیٹا چاہیے تھا۔ وہ اپنی ٹانگوں کو پیٹ میں سکیڑ کر گٹھڑی سی بن کر کونے میں گھس جاتی اور لالہ جی اسے پکڑ کر باہر گھسیٹتے، مارتے پیٹتے۔ اس پر خرچ کئے ہوئے پیسے ضائع جانے کے خیال سے ان کا غصہ اور بھی بھڑک اٹھتا۔ وہ اس وقت تک اسے گالیاں دیتے اور پیٹتے رہتے جب تک اس کا بے بس نیم جان جسم فرش پر چت نہ لیٹ جاتا۔

اس دہشت سے نئی بیوی کا دماغ ہلنے لگا۔ روز بروز اس کی حالت خراب ہوتی

گئی۔ وہ پاگل ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا جسم بگڑ چکا تھا، اُدھڑ چکا تھا۔ اس کی ریڑھ کی کچی ہڈیاں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ اور اس کی کمر خم کھا گئی تھی۔ اس کا ننھا بچوں سا چہرہ چند ہفتوں ہی میں بوڑھا اور غیر قدرتی معلوم ہونے لگا اور اس کی ڈراؤنی شکل پر چڑیلوں اور ڈائنوں کی پرچھائیاں دوڑنے لگیں۔ اس کے چہرے کی جھریوں میں چھپا ہوا خوف ہر وقت رحم کی التجا کیا کرتا۔ اس کی ہڈی ہڈی سے درد کے تیر چھوٹتے رہتے۔ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو چکا تھا لیکن لالہ جی کے جلدی سے جلدی باپ بننے کے خبط میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ایک دن انھوں نے لیلا کے سکڑتے چیختے تڑپتے جسم کو اتنا پیٹا کہ وہ ایسی لیٹی کہ پھر نہ اُٹھی۔

تیسری شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ پچھلی دفعہ سوڈیڑھ سو روپیہ گنوا کر لالہ جی نے سبق سیکھ لیا تھا۔ اس دفعہ ایک پندرہ سال کی لڑکی کا انتخاب ہوا۔ لڑکیوں کا بھلا کیا کال! اتنے ہی پیسوں میں پھر سودا ہو گیا۔ وہ تمام دوائیاں جن سے نرینہ بچے کا رنٹی کیا جاتا ہے انھوں نے اپنی بیوی کو بطور احتیاط کھلوا دی تھیں۔ اور امید بر آنے پر کئی قسم کی کتھا، چڑھاوے اور دان کا وعدہ کیا تھا۔ ان کو لڑکا چاہئے تھا اور اس کیلئے وہ ہر ایک قیمت دینے کو تیار رہتے۔ مرجانے پر جب ان کا لڑکا ان کی کھوپڑی کو توڑ کر ان کی آتما کو آزاد نہ کرے اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً اس تک پہنچانے کیلئے براہمنوں کو مختلف چیزیں دان نہ کرتا رہے تب تک اس کی مکتی ناممکن تھی۔

لالہ جی کی رام بن میں اناج کی دکان تھی۔ رام بن وسط یو۔پی میں چھوٹی سی منڈی تھی۔ جو اب کسی نامعلوم وجہ سے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ جدی پیشے سے حلوائی تھے لیکن منڈی کو ترقی کرتا دیکھ کر انھوں نے بھی اناج کی دکان کھول لی تھی۔ آٹے میں ریگ تنکے برادہ گرد، نمک میں دودھ پتھری۔ ہلدی میں ملتانی مٹی، مرچوں میں گیرو پیس کر "عمدہ اور سستی" چیزیں بیچا کرتے تھے۔ دال اور چاول وغیرہ کو بھاری کرنے کیلئے اس میں

چھوٹی چھوٹی کنکریاں ڈال دیا کرتے تھے۔ لکھنؤ کانپور میں بڑے بڑے ہوٹلوں سے چائے کی استعمال شدہ پتی خرید کر ان پر رنگ چڑھا کر "خالص چائے" بھی فروخت کیا کرتی تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے تنبا کو کے ضائع شدہ پتوں میں گھوڑے خچر کی لید ملا کر پیسے کی ملنے بکنے والی بیڑیاں بنانے کا کارخانہ بھی کھول رکھا تھا۔ لالہ جی کی نقل باقی دکانداروں نے بھی مختلف طریقوں سے کی تھی جس کا نتیجہ یہ کہ اب دیہات میں بھی باقی ہند کی طرح کسی خالص چیز کا ملنا ناممکن ہو گیا تھا۔

رام بن میں کوئی لیڈی ڈاکٹر تھی ہی نہیں۔ ان کی اونچی ایڑیوں والے جوتے ابھی ہندوستان کی ان کچی سڑکوں کی غلیظوں کو عبور نہیں کر سکتے تھے اور نہ وہاں کوئی ہسپتال یا زچہ خانہ تھا۔ اتفاق سے ایک سند یافتہ مڈوائف وہاں حال ہی میں آئی تھی۔ پیغام ملنے پر لالہ جی اسے اور اپنی بوڑھی خاندانی دائی کو لیکر گھر آ گئے۔

لالہ جی کی پہلی بیوی شیاما نے مڈوائف کو تو لوٹا دیا، وہ بیوہ تھی اس لئے اس کا زچہ کے سامنے جانا اچھا شگون نہیں تھا۔ دوسری بڑھیا چندھی کاہل سی دائی، ڈھیلے ماس، جھریوں اور سلوٹوں کی بنی ہوئی ایک عجیب سی چڑیل تھی۔ جس کے اعضا حرکت تک بڑی مشکل سے کر رہے تھے۔ اس کی مرجھائی ہوئی چمڑی پر میل کی تہیں جمی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اور میل اور گرد کی وجہ سے اس کے بال رسیاں بن چکے تھے۔ دائی کے پاس میلے سیاہ خون کے دھبوں سے بھرے ہوئے غلیظ متعفن کپڑوں کی گٹھری تھی جن کو وہ ہر زچگی کے موقع پر استعمال کیا کرتی تھی۔ اس نے دروازہ کے کواڑ کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ان کپڑوں کو پہن لیا اور اسی اندھیری کوٹھڑی میں چلی گئی کوٹھڑی کی دیواروں میں کھڑکی کی جگہ ایک چھوٹا سا سوراخ تھا جسے دائی نے آتے ہی بند کروا دیا تا کہ کہیں درزوں تک سے ہوا اندر نہ جائے کہ زچہ کو بخار ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ کمرہ میں پہلے ہی حبس تھا۔ اب اور بھی دم گھٹنے لگا۔ گرمی جسم میں چپچپی پیدا کر رہی تھی

پسینے کی دھاریں چھوٹ رہی تھیں۔ لحاف میں لپٹی ہوئی گرمی سے بے چین لیلا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اُبلتے ہوئے پانی کے حوض میں اسے ڈبو دیا گیا ہے۔ دیئے کی اندھیرے سے آتی ہوئی کرنیں کالک سے اٹی اور گرد سے لپٹی ہوئی دیواروں اور جالے سے بھری ہوئی چھت کی طرف جھانک رہی تھیں۔

لیلا کی سوتن انگیٹھی میں کوئلے سلگا کر لے آئی اور اس کو چارپائی کے نیچے رکھ دیا۔ سات سبز ڈنڈی والی سُرخ مرچوں کو اس نے لیلا کے سر کے اِرد گرد پھرا کر آگ میں ڈال دیا تاکہ اگر کوئی نظر گذر ہو تو اس کا اثر زائل ہو جائے۔ مرچیں آگ کی لمبی لمبی زبانوں میں تبدیل ہو گئیں۔ اور ان کے جلنے سے کمرے کی ہوا اور بھی سڑاند سے بھر گئی۔ لیلا کا دل ایسے پھڑپھڑا رہا تھا جیسے دیئے کی لَو پھونک لگنے سے پھڑپھڑانے لگتی ہے۔ اس کی کپکپاتی کنپٹیوں میں مبہم گھڑی کی ٹِک ٹِک اسے آنے والے دشوار وقت سے خبردار کر رہی تھی۔ اس کے پسینے سے نچڑتے چہرے پر کئی برس سے دل کی سلوٹوں میں چھپی ہوئی تمنائیں نمودار ہو رہی تھیں۔ ننھی ننھی نابالغ بے آس تمنائیں جنھوں نے کبھی بھی امید کی جھلکیں دیکھی نہ تھیں۔ اس کی آنکھوں کی المناک گہرائیوں میں بیتے ہوئے دُکھ بھرے سمے کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کے دانت کھٹے اور کسیلے ہوتے جا رہے تھے اس کی چیخیں اور آہیں اندر سے کُرید کُرید کر زندگی باہر نکالتی معلوم ہو رہی تھیں۔

دائی لیلا کے جسم کو اپنی تربل سُست مٹھیوں سے گوندھنے لگی۔ اس کی تمام انگلیاں میل سے سیاہ ہوتی ہوئی چاندی کی انگوٹھیوں اور چھلوں سے بھری ہوئی تھیں، اور باہیں گجروں، کڑوں، بانکوں اور چوڑیوں سے جو اگرچہ بھانت بھانت کی تھیں لیکن میل اور سیاہی نے انھیں ایک جیسا بنا دیا تھا۔ وہ لیلا کے جسم پر کھڑی ہو کر اسے کچلنے لگی۔ دائی لیلا کے جسم پر اوپر نیچے چلتی جا رہی تھی اور لیلا کا پتلا سوکھا نیم جان جسم اتنا بوجھ نہ سہار سکنے کے باعث اِدھر اُدھر تڑپنے اور کروٹیں لینے کی کوشش کر رہا تھا اور

وہ "بس کر دیں مری"، چیخے جا رہی تھی۔ آخر لالہ جی کے کہنے سے دائی نیچے اتری اور پھر اس کا پیٹ گوندنے لگی۔

لالہ جی ایک پیڑھا لے کر چارپائی کے قریب آ بیٹھے۔ ان کی لمبی لمبی مونچھیں نچلے لب کے نیچے تک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھیں۔ منہ کے کناروں پر بالوں کی گھنی جھاڑیاں تھیں جن پر ڈھیلے موٹے پُر شکن آسودہ حال گال لٹک رہے تھے لمبی لمبی پلکوں اور بھوؤں کے لچھوں نے آنکھوں کو نیم پوشیدہ کر رکھا تھا۔ کانوں میں سے بھی جو جلیبو کے کانوں کی طرح اکڑے ہوئے تھے۔ بال لٹک رہے تھے۔ اس کے بجز مشین سے صاف کئے ہوئے سر میں سے چھوٹی سی چوٹی ایسی لٹک رہی تھی جیسے گھسے ہوئے پائیدان میں سے اُدھڑی ہوئی رسّی۔ طوطے کی چونچ نے حرکت کی۔ چھدری کھچڑی مونچھوں کی چلمن میں سے پیلے کسیلے ناہموار بے ترتیب دانتوں کی قطاروں نے جھانکا۔ لالہ جی گنگنائے "لڑکا ہوگا لڑکا۔ میری دائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ جب میں دائی کو بلانے گیا تھا تو مجھے مہتر ملا تھا۔ اس سے اچھا شگون اور کیا ہو سکتا تھا۔"

یہ کہہ کر لالہ جی اپنے دائیں انگوٹھے سے ماتھے کے پسینے کو نچوڑنے لگے۔ ان کی کھدّر کی بنڈی بھی بالکل بھیگ چکی تھی۔ ایک آہنی ہنسی ان کے چہرے پر رینگنے لگی۔ اور وہ اپنی غیر قدرتی طور پر ابھری ہوئی دوہری ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ لیلا کسی ناقابلِ فہم سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی پتلی تیکھی ناک سرخ سے سرخ تر ہوتی جا رہی تھی اس کے سر کے بالوں تک سے پسینہ نچڑ رہا تھا۔ شدّتِ درد اور حبس سے اس کے پتلے پتلے بندھے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

لالہ جی بھی سوچنے لگے کہ اگر لڑکی ہوئی تو ——— بے معنی غصّہ سے اُن کے اعضا کانپنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں چنگاریاں چمکنے لگیں۔ دانت کچکچاتے ہوئے بڑبڑائے "اگر لڑکی ہوئی تو ماں بیٹی دونوں کی خیر نہیں۔"

"ایسے بُرے الفاظ مُنہ سے مت نکالئے" لالہ جی کی پہلی بیوی نے منت کی۔ لیلا اپنے پھٹے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ اس کی طنز بھری آنکھیں جو بیویوں کی طرف اٹھی ہوئی تھیں ان سب کی ہنسی اڑاتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

"بڑا انتظار کروایا ہے اس پُتر نے" لالہ جی نے پھر کہنا شروع کیا "بڑی قسمت والا ہوگا۔ بڑی منّتیں چڑھاوے لیکر آیا ہے۔ ہم اس کا کوئی خاص نام رکھیں گے۔ امر دولت رام، گوری شنکر، رام ناتھ، اوم پرکاش سے تو میں اکتا چکا ہوں۔ ایسا نام رکھوں گا کہ لوگ کہیں گے کہ لالہ جی نے نام بھی سو میں ایک رکھا ہے۔"

لالہ جی بڑے پُر اشتیاق طریقے سے مونچھوں پر ہاتھ پھیرنے اور مسکرانے لگے لیکن انھیں ایسا محسوس ہوا کہ یہ مسکراہٹ ان سے امید چھینے اور انھیں آزردہ بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ لیلا کے کانوں میں طوطیاں بول رہی تھیں۔ اپنے خاوند کو مسکراتا دیکھکر اس نے بھی لب کھول دیئے۔ ایک بے دل ہنسی کی کپکپاتی ہوئی لہریں اس کے چہرے پر سنناہٹ پیدا کرنے لگی۔ کمرے کی بند ہوا سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولنے کیلئے اشارہ کیا۔

"نہیں دروازہ مت کھولنا۔ ہوا لگنے سے بخار ہو جاتا ہے" دائی اپنے پوپلے منہ کو ہلاتے ہوئے بولی۔

کمرے کی ہوا بہت بھاری ہو چکی تھی۔ دیئے کی بتّی میں سے کالک کی ایک لمبی لکیر نکل رہی تھی۔ لالہ جی نے باہر سے حقّہ منگوایا اور اسے گڑگڑانے لگے۔ ساتھ ساتھ جیب میں پڑی ہوئی بنارسی پھول دار سفید ڈبیہ میں سے پان نکالا نکال کر کھانے اور سرخ تھوک سے دیوار کی پُتائی کرنے لگے۔ لیلا پر ذرا اور جھک کر انھوں نے نئے بیٹے کے لئے عجیب عجیب سے پندرہ بیس نام دوہرائے اور خود ہی انھیں نامنظور کرتے گئے۔ پھر بیوی کے اور بھی قریب ہوکر بڑے پیار سے بولے "پھر تم ہی بتاؤ اس کا کیا نام رکھیں؟" لیلا نے صرف ایک پھیکی مسکراہٹ

سے ان کے سوال کا جواب دیا۔ جس نے اس کے چہرے کو اور بھی ڈراؤنا بنا دیا۔

دائی نے لیلا کو اٹھا کر دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا اور اس کے پھولے ہوئے پیٹ کو گوندھنے، رگڑنے، تھپکنے اور اس پر ہلکی ہلکی چوٹیں لگانے لگی۔ اور پھر اس کے نچلے حصے پر ایک میلا غلیظ کپڑا جو وہاں اسی مطلب کیلئے رکھا ہوا تھا باندھ دیا تاکہ زچگی کے بعد زیادہ خون نہ بہے۔ اس کے بعد لیلا کو دوبارہ چارپائی پر لٹا دیا گیا۔

اتنے عرصے میں برادری کی عورتوں کو بھی خبر مل چکی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آتی جا رہی تھیں۔ اور اسی کوٹھڑی کے ایک کونے میں آپس میں ٹھس ٹھس کر بیٹھتی جا رہی تھیں دائی اب میلے غلیظ انگوٹھیوں کی جھریوں سے لدے ہوئے ہاتھوں سے بچہ پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگی "تم لوگ دائیوں کو بالکل سر پڑی پر ہی بلاتے ہو۔ کہیں زیادہ پیسے نہ لے جائے" دائی نے طعنہ دیا "اگر پہلے و بلنے، گھونٹنے اور مالش کرنے کیلئے کبھی کبھی بلا لیا ہوتا تو اتنی تکلیف کیوں ہوتی؟"

"تکلیف تو ہوگی ہی" ایک بوڑھی عورت نے اپنے نتھنوں میں چھنگلیا پھیرتے ہوئے کہا "یہ آجکل کی چھوکریاں تو کسی کا کہنا مانتیں ہی نہیں۔ ہمارے وقتوں میں گابھن استریاں ہر مہینے تلسی ماتا کی پوجا کیا کرتی تھیں۔ پیپل کو دودھ چڑھایا کرتی تھیں منگل وار کا برت رکھا کرتی تھیں۔ کبھی بھی گوکھرو کی جھاڑیوں پلکے ہوئے کھیتوں کے قریب نہیں جاتی تھیں، پورنماشی کی رات کو گھر سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ کسی کی ارتھی کی طرف بھول کر بھی نہیں دیکھتی تھیں۔ نہ چکی پیستی تھیں۔ نہ لکڑیاں توڑتی تھیں اور نہ کوئلوں یا دوسری کالی چیزوں کو ہاتھ لگاتی تھیں۔ آجکل تو کوئی پرانے رسم ورواج کو مانتا ہی نہیں۔ دکھ تو آپ سے آپ ہوگا"

"گابھن عورتوں کو کنوئیں کے قریب بھی نہیں جانا چاہیئے۔ آجکل تو سب جاتی ہیں" ایک سوکھی ہوئی زرد رنگ کی نوعمر لڑکی نے بار بار کھانس کر کہا۔

دیئے کی لو مدھم پڑچکی تھی۔ لالہ جی کی پہلی بیوی شیاما نے گل جھاڑ کر بتی کو اونچا کرتے ہوئے کہا "یہ تو کسی شاستر میں نہیں لکھا"

"شاستر واستر تو مجھے پتہ نہیں" اس لڑکی نے منہ پر ہاتھ رکھکر کھلکھلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایسا کرتے نہیں۔ ہمارے گاؤں میں ایک برہمن تھا جگا دری۔ اس نے ایک کنواں کھدوایا بہت گہرا لیکن اس میں پانی نہ آیا۔ بہت کوشش کی لیکن وہ خشک ہی رہا، ایک رات اندر دیوتا نے اسے درشن دیئے اور کہا کہ اگر تو اپنی بہو کو جو اس وقت گابھن تھی جل دیوی کی بھینٹ کر دے گا تو کنوئیں کی گود ہری ہو جائے گی۔ اس نے کنوئیں کی خشک تہ پر جل دیوی کو بھوجن کھلانے کا بچن کیا۔ ایک لمبی سیڑھی کی مدد سے اپنی بہو کو لیکر نیچے اترا۔ کھانا وغیرہ تہ پر بچھایا اور پھر اس نے اور چیزیں لانے کے بہانے اوپر آکر سیڑھی اٹھالی کنوئیں کی تہ سے فوراً ہی پانی پھوٹ پڑا۔ اس دن سے کوئی پیٹ والی کنوئیں کے قریب نہیں جاتی کہ کہیں جل دیوی بلی نہ مانگ لے۔"

اس پر مختلف عورتوں نے جن کا اب اچھا خاصا جمگھٹا ہو گیا تھا اپنی رائے ظاہر کی۔ دائی اپنی کوشش میں مصروف تھی اور یہ عورتیں کانا پھوسی کئے جا رہی تھیں۔ دیئے کی لو سوچ رہی تھی کہ ان اندھیری کوٹھڑیوں میں پیدا ہونے والی قوم کے دل میں اگر ہمیشہ تاریکی ہی رہے تو کیا تعجب ہے۔"

اس وقت تک دائی بچہ پیدا کرنے کے وہ تمام ذرائع ختم کر چکی تھی جو اس نے پچھلے بیس برس کے تجربے سے سیکھے تھے۔ اس کوشش میں اس کی بوڑھی قوت اب بالکل تھک چکی تھی۔ پسینے کی موٹی موٹی بوندیں اس کے جھریوں سے بھرے ہوئے چہرے سے ٹپک رہی تھیں۔ اور اس کی میل سے بھری ہوئی گردن اب بالکل بھیگ چکی تھی۔ اس کی بھووں کے تشویش سے اکڑے ہوئے بال سوچ رہے تھے کہ کیا کیا جائے۔ جیسے جیسے بچہ پیدا ہونے میں دیر ہوتی جا رہی تھی لالہ جی بیتاب ہوتے جا رہے تھے۔ ان کا حوصلہ

ٹوٹ رہا تھا۔

نیلا کا درد اب بہت بڑھ چکا تھا۔ درد کی تیز لہریں اس کی ڈھیلی ہڈیوں میں پھنس کر چیخ رہی تھیں۔ اس کا سر کندھوں میں ڈوبتا جا رہا تھا اور وہ بڑی بے ترتیبی سے سانس لے رہی تھی۔ اس کی مٹیالی سوجی ہوئی آنکھوں میں لال ڈورے نمودار ہو رہے تھے۔ اس کے دماغ میں کوئی شئے گیند کی طرح اچھل رہی تھی۔ اس کمرہ کی ساکت دنیا میں سے غیر مانوس ڈراؤنے خیالات کی قطاریں اس کی طرف رینگ رہی تھیں۔ نیلا کی سوتن اور ایک دو اور عورتیں آگے بڑھ کر اس کے جسم کو دبانے رگڑنے لگیں۔ دائی اب بچہ پیدا کرنے کیلئے اپنے ہاتھ پاؤں اور تمام بوڑھی عقل استعمال کر رہی تھی۔

دائی ہر پانچ منٹ بعد اپنے ہاتھوں کو کوٹھڑی کے کچے فرش کی گندی مٹی پر رگڑ کر اس عمل کو دوہرانے لگی۔ لیکن ہر دفعہ ناکام ہی رہتی۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے جوؤں اور لیسیئے بھرے سر کو بھی کھجاتی جاتی اور اپنے بوڑھے کھانستے حلق میں سے بلغم کے گولے اُگلتی جاتی۔ اس طرح آدھا گھنٹہ اور گذر گیا۔ اُداسی اور مایوسی آہستہ آہستہ کمرے میں رینگتی چلی آ رہی تھیں۔ عورتوں کی آوازیں بھی اب مدھم پڑ چکی تھیں۔ شدتِ حبس سے سب کا دم گھُٹ رہا تھا۔ لالہ جی کے چہرے پر کبھی غم کی گہری سیاہیاں دوڑنے لگتیں اور کبھی غصہ سے ان کے ماتھے پر ننھی ننھی سپنولیاں حرکت کرنے لگتیں۔ نیلا کی آنکھوں کے کناروں میں اٹکی ہوئی آنسوؤں کی دو بوندیں ان کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔

لالہ جی کی پہلی بیوی باہر سے کتھا کی پستک اٹھا لائی اور ایک ادھیائے نکال کر اس نے دیئے کے قریب بیٹھی ہوئی عورت سے پڑھنے کیلئے کہا۔ وہ پڑھنے لگی "شری شکدیو جی بولے ہے راجہ ایک سمے پرتھوی منش تن دھارن کرا کٹھن تپ کرنے لگی۔ تب برہما، وشنو، رودر ان تینوں دیوتاؤں نے اس سے پوچھا کہ تو کس لیئے اتنا کٹھن تپ کرتی ہے۔ دھرتی بولی۔ مجھے پتر کی واسنا ہے اس کارن مہا تپ کرتی ہوں"

ابھی وہ پڑھ ہی رہی تھی کہ ایک عورت جس کے لمبے لمبے دانت بڑے وحشیانہ طریقے سے ہونٹوں کے باہر جھکے ہوئے تھے بولی "یہ تو پریم ساگر ہے۔ اس وقت تو گوپال ستتان منتر یا دُرگا پاٹھ کا دیہی اپنا دی منتر کا جاپ ہونا چاہئے۔ کسی براہمن کو کیوں نہیں بُلا بھیجتے؟"

ایک براہمنی تو باہر آئی ہوئی تھی۔ بچہ ہونے پر اسے سب سے پہلے اسے ہی دکشنا ملنی تھی۔ لیکن وہ کوٹھڑی کے اندر نہیں آسکتی تھی۔ کیونکہ جس وقت عورت قوم کو ایک نئی زندگی کا تحفہ دے رہی ہوتی ہے اس وقت کو ہندوستان میں اس کی زندگی کا ناپاک ترین عرصہ سمجھا جاتا ہے۔ باہر ہی وہ اور اس کا خاوند لمبی بحر میں منتر پڑھنے لگے "دیکھانتی الیتیم ــــ بھاگیسم سوسے جنم کا رکم مُنگل پکھنے" اور یہ آوازیں سب کے کانوں میں سنسنی پیدا کرنے لگیں۔

لیلا کی قوت کا چھوٹا سا ذخیرہ اب بالکل ختم ہو چکا تھا۔ اس کا سارا بل چوسا جا چکا تھا۔ انتہائی گرمی کی وجہ سے اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ارد گرد بہت سی بھٹیاں دہکا دی گئی ہیں جن کی تپش سے اس کا جسم جھلسا جا رہا ہے۔ وہ اب بالکل بیدم ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے ڈراؤنی بھیانک پرچھائیاں پھیل اور سکڑ رہی تھیں۔ قریب بیٹھی ہوئی عورتیں اسے میلوں کے فاصلے پر معلوم دے رہی تھیں۔ دیوار پر لالہ جی کے پان کی پیکیں اسے چڑیلوں، بھوتوں کی خون سے بھری زبانیں دکھائی دیتی تھیں۔ اس کی طرف ناواقف وحشت خیز سائے بڑھتے چلے آ رہے تھے ــــــ!

کمرے کی ہوا اب بالکل دھواں بن چکی تھی۔ سب کا دم گھٹ رہا تھا۔ ایک عورت نے آگے بڑھ کر دیوار کے سوراخ پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ باہر بیٹھی ہوئی دو پہرا اندر جھانکنے لگی۔ چند لمحات کے بعد دائی نے سوراخ بند کروا دیا۔

دائی بچہ پیدا کرنے کی آخری کوشش میں انگوٹھیوں کی چھریوں سے لدے ہوئے ہاتھوں کو بڑے ظالمانہ طریقے سے استعمال کر رہی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر گھما کر جو کچھ ہاتھ میں آتا اُسے باہر کھینچنے کی کوشش کرتی۔ لیلا بڑے دردناک طور پر چیخ رہی تھی۔ اس کے پھٹے ہوئے دیدوں میں سے جو اب اور بھی بھڑک اٹھے تھے، گرم گرم، گدلے آنسو اس کے تنے ہوئے نیلگوں چہرے پر ٹپک رہے تھے۔ اسے اپنی کمر بیچ میں سے ٹوٹی ہوئی معلوم دے رہی تھی۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اسے زمین سے اکھاڑ کر ہوا میں پھینک دیا گیا ہے۔ اور وہ بے پناہ آندھی میں ایک سوکھے پتے کی طرح ہچکولے کھا رہی ہے۔ اور یہ دُنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے جو اوروں کیلئے تو کیا اپنے لئے بھی غیر ضروری ہیں۔ ایک تنکے سے زیادہ قوت نہیں رکھتے۔ اس کا بھورا مٹیالا رنگ اب سیاہ پڑ چکا تھا۔ اس کی سُرخ آنکھیں ہر ایک کی طرف غضب ناک ٹکٹکی سے دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ انہیں کبھی کبھی زور سے بھینچ لیتی تھی۔ ایک پتنگا دیئے کی لو پر دیوانہ وار سر پٹخ رہا تھا۔

دائی نے پھر ہاتھوں کو اِدھر اُدھر گھمایا۔ پھر زور لگایا۔ بچے کو لیکی ———— اس کے ہاتھ میں انسانیت کا ایک چھوٹا سا چیتھڑا تھا۔ چند سوکھی ہوئی ہڈیوں کا گلابی ڈھانچہ۔ جس کا ایک بازو چھل کر اندر ہی رہ گیا تھا۔ اس نے وہ بازو بھی باہر نکالا۔ لیلا نے کچھ افاقہ محسوس کیا۔ لالہ جی نے لپک کر دیکھا۔ لڑکا تھا۔ خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ ان کے دل پر میٹھی میٹھی خوشی کی ٹھنڈی ٹھنڈی پھواریں برسنے لگیں۔ اب وہ آرام سے مر سکے گا۔ ایک نئی خوشی کی کپکپاتی لہریں اس کے جسم پر دوڑنے لگیں "ہے بھگوان دھنیاد!" اس کے منہ سے خود بخود نکل گیا۔

لیلا بھی مسکرائی۔ ہلکی مسکراہٹ۔ وہ اب باعزت جی سکتی تھی۔ وہ اب بیٹے کی ماں تھی۔

لیلا کی آنکھوں سے ابھی تک نہ بھولنے والا دکھ جھانک رہا تھا۔

"پچھلے جنم میں بیچاری نے بہت پاپ کئے ہوں گے جو اتنا کشٹ اٹھانا پڑا" ایک عورت نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

دنیے کی ترٹپتی، پھر پھڑاتی مدھم نگین کو ہمدرد آنکھوں سے ماں بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ اس نئے بچے نے بھی پچھلے جنم میں بہت پاپ کئے ہونگے جو ہندوستان میں پیدا ہوا۔ اور پیدائش ہی میں اس کا ایک بازو چھن گیا۔

دو اسٹیشنوں کے درمیان

گاڑی کی کھٹ کھٹ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔ امرتسر کا اسٹیشن آنیوالا تھا میرے حواس ابھی تک اچھی طرح سنبھل نہیں سکے تھے۔

ہندوستان میں ریل گاڑی کا سفر اور وہ بھی تیسرے درجے کا۔ میں تو اس ایک رات کے سفر کو ایک ماہ کی قیدِ مشقت سے بھی زیادہ سخت اور تکلیف دہ سمجھتا ہوں جب میں لاہور اسٹیشن پر اس گاڑی میں سوار ہونے کیلئے پہنچا تو وہاں پہلے ہی بہت سے لوگ جمع ہوگئے تھے۔ گاڑی جانے سے پون گھنٹہ پہلے اسٹیشن پر پہنچ جانے کے باوجود اندر گھسنے کیلئے انتہائی کوشش کرنی پڑی۔ پنجاب کلکتہ میل میں تیسرے درجے کے صرف تین ڈبے ہوتے ہیں۔ دو مردانے اور ایک زنانہ۔ زنانہ ڈبہ تو تقریباً خالی ہی تھا کیونکہ ہندوستانی مرد اپنی عورتوں کو ان کے اپنے کیا، خدا تک کے بھروسے پر چھوڑنے کو تیار نہیں۔ دونوں مردانہ ڈبوں میں خوب بھیڑ بھڑکا تھی۔ بہت کوشش اور معرکہ

خیر جدوجہد کے بعد میں اور ڈیڑھ درجن کے قریب اور مسافر اس ڈبے میں گھسنے میں کامیاب ہو گئے۔

ڈبے کے ایک طرف جلی حروف میں لکھا ہوا تھا "۵۳ مسافروں کے واسطے"۔ لیکن اس میں اتنے مرد اور عورتیں اور بچے بھرے پڑے تھے کہ ان کا شمار کرنا مشکل تھا۔ پنجاب کلکتہ میل میں تیسرے درجے کے سو میل سے کم سفر کی اجازت ہی نہیں۔ سب لمبے سفر کے مسافر تھے نشستوں کے اوپر کے سب تختے سامان سے لدے ہوئے تھے۔ نیچے بھی بستر ے، ٹرنک، سوٹ کیس، ہینڈ بیگ، گٹھڑیاں بڑی بے ترتیبی سے بکھری پڑی تھیں۔ آدھے کے قریب مسافر نشستوں پر سکڑ سکڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور کچھ فرش پر بڑے ہوئے سامان پر۔ باقی مسافر دونوں طرف کے دروازوں کے درمیان کھڑے تھے۔

گاڑی چلی۔ کچھ دیر تو تو میں میں، گالی گلوچ ہوئی اور بہت سے مسافروں نے کسی نہ کسی طرح اپنے لئے آہستہ آہستہ جگہ بنا ہی لی۔ میں پریشان تو پہلے ہی تھا، اس بھیڑ اور دھکا پیل نے میرے غم زدہ دل کو اور بھی بے حال کر دیا۔ گھبراہٹ سے میرا سر چکرا رہا تھا۔ منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اور میں چھت سے لٹکتی لوہے کی زنجیر کو پکڑے، سر نیچے لٹکائے، آنکھیں موندے ایک مبہم سی سوچ کے غلبہ میں بےبس کھڑا تھا۔

لاہور میں تین برس کے بعد آنا ہوا تھا۔ مجھ سی ہی بدنصیب بہن کے تپ دق سے مر جانے کی خبر ملنے پر آنا پڑا۔ اور میں بےبسی کے عالم میں یہ حساب لگا رہا تھا کہ ان قرض لئے ہوئے پندرہ روپیے کی گرانبار رقم کو، جو اس آنے جانے پر خرچ ہو گئی ہے، ادا کرنے کیلئے ایک بائیس روپیے ماہوار پانے والے کلرک کو کتنے مہینے یا برس اپنا پیٹ کاٹنا پڑے گا۔ پھر یہ خیال، کہ میں اپنی عزیز بہن کو موت کے خلاف جنگ کرنے

تین چار روپئے مہینے کی دوائیوں کی مدد تک نہیں پہنچا سکا۔ مجھ پر لعنت ملامت کرنے لگا اور کبھی کبھی مجھے اپنے پرانے ہم جماعت اور جگری دوست راجندر کمار کھنہ کا خیال آجاتا۔ جس سے میں لاہور میں مل نہیں سکا تھا۔ آٹھ مہینے ہوئے اس کی شادی کا دعوت نامہ آیا تھا۔ اس مبارک موقع پر شریک ہونے کیلئے لاہور آنے تک کا کرایہ تو کیا مبارکباد کا خط لکھنے کے لئے پانچ پیسوں کا بمشکل انتظام ہوا تھا۔ اب میں لاہور آیا ہوا تھا تو اس سے ملنے کی کچھ اور کوشش کرنی چاہیے تھی۔ ملاقات ہوئے تین سال ہو چکے تھے اور معلوم نہیں کب قسمت ادھر لائے یا کبھی بھی نہ لائے۔ پھر یہ خیال کہ خدا مجھ پر اس سے زیادہ اور کیا مہربانی کر سکتا ہے کہ مجھے اس زندگی کی لعنت سے آزاد کر دے۔ بڑے بھیانک طریقے سے میرے ذہن میں ابھرنے لگا۔

خیالات کی اس کشمکش میں کافی وقت گذر گیا۔ گاڑی بھاگتی ہوئی اٹاری کے اسٹیشن سے گذر گئی۔ مجھے بے حس کھڑا دیکھ کر کئی مسافر میری طرف متوجہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے میرے پرانے زنگ خوردہ ٹرنک کو سامنے سیٹوں کے درمیان رکھ دیا اور میرا بازو ہلا کر مجھے اپنی طرف متوجہ کیا اور اس ٹرنک پر بیٹھ جانے کیلئے کہا۔ میں جسمانی طور پر بالکل چور ہو چکا تھا۔ میری آنکھیں لاتعداد تھکے ہوئے اونگھتے مسافروں کو دیکھ کر اور بھی بے حس ہو گئیں۔ اور میں شکریہ ادا کرنے کی زحمت کئے بغیر ٹرنک پر جا بیٹھا۔

میرے قریب بیٹھے ہوئے مسافر میرے گھبرائے ہوئے پریشان چہرے کو بغور دیکھنے لگے اور اس بدحواسی کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ مجھے بھی اپنی حالت پر پشیمانی محسوس ہوئی اور میں اپنے حواس سمیٹنے لگا۔ کھڑکی میں سے آتے ہوئے ٹھنڈے جھونکے میری مدد کرنے لگے۔

میری بائیں کھڑکی کے برابر والی نشستوں پر ایک سکھ نوجوان بیٹھا تھا۔ دوہری

کشتی نما پٹیالوی پگڑی، اچھا سا قیمتی سوٹ، ہم رنگ ٹائی اور قمیص۔ میک اپ سے
اس نے بھی بہت سے فیشن ایبل سکھ نوجوانوں کی طرح مہاراجہ پٹیالہ کے چھوٹے
بھائی بننے کی کوشش کی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا ایک ہم عمر نوجوان بیٹھا ہوا
تھا۔ اس کے کشادہ بالائی لب پر مونچھوں کی جگہ ایک سیاہ لکیر تھی۔ گیبرڈین کے کپڑے
کی پتلون، چیک دار ریشمی قمیص، جس کے نوک دار کالروں میں نکٹائی ڈھیلی گرہ
قمیص کے درمیانی بٹن تک لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے آگے ایک سکھ جاٹ پھنس کر بیٹھا
ہوا تھا۔ بالکل فوجی قدوقامت، اوپر کی طرف اٹھا کر باندھی ہوئی ڈاڑھی، سفید پگڑی
قمیص پاجامہ اور نوک دار دہقانی جوتی۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی بھولے
مٹیالے رنگ کی عورت۔ اس کے سات نیم فاقہ زدہ برہنہ بچے اور اس کا چودہ پندرہ
روپے ماہوار پانے والے ریلوے قلیوں کی موٹی نیلی وردی پہنے ہوئے خاوند۔ یہ
سب گز ڈیڑھ گز جگہ میں سکڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میرے دائیں طرف ایک بے حال سی
بڑھیا ٹانگیں سکیڑے اور اپنی ٹھوڑی کو گھٹنوں پر ٹکائے کسی درد بھری سوچ میں محو تھی۔
جگہ جگہ پیوندوں سے اٹی ہوئی میلی دھبے دار گھگھری۔ بوسیدہ قمیص، سر پر گاڑھے
کی غلیظ متعفن چادر۔ اس کے پوپلے منہ میں رخساروں کی ڈھیلی جھریوں بھری چمڑی
اس قدر اندر دھنسی ہوئی تھی کہ اس کے دونوں جبڑے الگ الگ معلوم ہوتے تھے۔
اوپر والا حصہ نچلے سے بالکل علیحدہ۔ اس پر احتیاط سے رکھا ہوا۔ اور ایسا محسوس ہوتا
تھا کہ ابھی یہ بڑھیا ہلی اور وہ گرا۔ اس کے ساتھ ایک عجیب سی ہیبت ناک صورت والا
آدمی بیٹھا ہوا تھا جس کی عمر کا اندازہ لگانا از حد مشکل تھا۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا
تھا کہ کسی تپ دق سے مرے ہوئے آدمی کے زرد پنجر کو قبر سے کھود کر اس پر چمڑی
چڑھا دی گئی ہے۔ اس کے چہرے سے ایسا معلوم پڑتا تھا کہ اس کی کبھی ڈاڑھی مونچھیں
اگی ہی نہیں۔ گہرے تاریک گڑھوں میں چھپی ہوئی مجرمانہ آنکھوں کو بے ڈھنگ طور

پر باہر اُبھری ہوئی رخسار کی ہڈیوں نے اور بھی ڈراونا بنا دیا تھا۔ اس کے آگے ایک ۲۹۔۳۰ سال کی عورت جو شکل و صورت سے انتہائی غریب معلوم ہوتی ہے اپنی گود میں دو بچے لٹائے بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ایک تعلیم یافتہ سنجیدہ مزاج نوجوان، سادہ لباس میں ملبوس اور ایک ویسی ہی سادہ خوبصورت لڑکی بالکل ساکت اور خاموش اُن کے پیچھے اونچے نیچے بے ڈھنگے بے ترتیب سروں کا ہجوم اور آخر میں مختلف قسم کے سامان کی دیوار۔

میں نے سادہ لباس والے نوجوان کی طرف دیکھا اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں نے پہلے بھی اسے کہیں دیکھا ہے۔ میرے قریب بیٹھے ہوئے گیبرڈین کی پتلون والے نوجوان نے مجھے بڑے دوستانہ اور بے تکلف انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہا "کیا بات ہے مسٹر! بڑے بوکھلائے ہوئے ہو؟"

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ایک افسردہ تھکی ہوئی مسکراہٹ میں اپنے لبوں کو کھول دیا اور اس کے سوال کو خاموشی میں ڈوب جانے دیا۔ وہ میرے ہاتھ سے کہانیوں کی کتاب لیکر ایک کہانی پڑھنے لگا۔

اتنے میں گاڑی امرتسر اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ میں بھی دوسرے مسافروں کی طرح پلیٹ فارم پر مجمع کی طرف دیکھنے لگا۔ پٹرول راشن ہو جانے سے لاریاں میں اب بہت کم ہو گئی ہیں۔ اور ریلوے اسٹیشنوں پر پہلے سے بھی بہت زیادہ بھیڑ ہوتی ہے۔

گاڑی جب پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی تو مسافر، قلی، خوانچہ فروش بے تحاشہ ڈبوں کی طرف لپکے۔ خوب دوڑ دھوپ، دھکم دھکا، چیخ پکار ہوئی۔ ہر طرف ابتری۔ پریشانی، گھبراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ ڈیڑھ دو درجن مسافر ہمارے ڈبے کی طرف بھی بڑھے اور دونوں طرف کے دروازے کھولنے کی کوشش کرنے لگے۔ ایک

طرف کا دروازہ تو اسباب سے بالکل جما ہوا تھا۔ دوسرے دروازے پر خوب دھکے پر دھکے پڑنے لگے۔ باہر والے مسافر دروازہ کھولنے اور اندر گھسنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور اندر دروازے کے قریب کھڑے مسافر اسے بند ہی رکھنے پر زور لگا رہے تھے، جھگڑا، تکرار، گالیوں کی بوچھاڑ، غصہ اور رعب سے بھرے ہوئے الفاظ۔ خوب رسہ کشی اور زور آزمائی ہو رہی تھی۔ کئی مسافروں نے کھڑکی ہی سے ہی ٹرنک، بستر، گٹھڑیاں بغیر کسی قسم کی احتیاط کے اندر پھینکنی شروع کر دیں۔ کئی جلد باز کھڑکیاں پھاند کر اندر ایک آ گئے۔

بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کی جھنکار سنائی دی۔ ایک کھدر پوش نوجوان کو حراست میں لئے ہوئے دو سپاہی اپنے لئے جگہ تلاش کر رہے تھے۔ وہ ہمارے ڈبے کے دروازے کی طرف بڑھے۔ رعب داب سے دروازہ کھلوا کر اندر داخل ہوئے اور ان کے پیچھے تمام ہجوم بھی کسی نہ کسی طرح اندر آ گھسا۔ اور پھر وہی بہرہ کر دینے والا جھگڑا شروع ہو گیا۔ سپاہیوں نے ایک ٹرنک پر سوئے ہوئے بچے کو اٹھوا کر اپنے بیٹھنے کے لئے جگہ بنا لی اور کھدر پوش نوجوان چھت سے لٹکتی زنجیر کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پلیٹ فارم کے دوسری طرف والے دروازے سے بھی ایک بلا ٹکٹ سفر کرنے والا سادھو، ایک پلنیہ ور دوائی فروش اور ایک بسنتی لباس والا یتیم خانہ کا لڑکا گاڑی کے اندر آ گئے۔

نشستوں کی درمیانی جگہ اسباب اور مسافروں سے بالکل بھر گئی تھی۔ بھیڑ اور جمگھٹے سے دم گھٹنے اور جی متلانے لگا۔ ابھی تک لڑتے جھگڑتے ہوئے مسافروں کی چیخیں مدھم نہیں ہوتی تھیں۔

گاڑی چلی، ہوا لگی۔ دم میں دم آیا۔ ایک شخص نے اس کھدر پوش قیدی کیلئے بھی جگہ بنا دی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ خالصہ کالج امرتسر میں ایم۔ اے کا طالب علم ہے اور سرہند میں طالب علموں کے جلسے میں تقریر کرنے کے الزام میں گرفتار کر کے اسے

لے جایا جا رہا تھا۔

سر سے پاؤں تک بسنتی کپڑے پہنے ہوئے یتیم خانہ کا لڑکا یتیم خانہ کا چندہ اکٹھا کرنے کی صندوقچی زور زور سے کھٹکھٹا کر چلانے لگا۔ "اے مسافر جانے والو دیکھنا منہ پھیر کر کس لئے ہم کھڑے ہیں راستہ گھیر کر۔ گل گیا، گلشن گیا بلبل کی سواری آ گئی۔ اب جگر کو تھامنا میری بھی باری آ گئی۔" اتنے میں دوا فروش بھی مونچھوں کو تاؤ دے کر اور بیگ کھول کر تیار ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی چھڑی سے یتیم لڑکے کو خاموش رہنے کا حکم دیا۔ پھر وہ دو روپے تولہ بکنے والا خالص اصلی کسوٹی پر ٹھیک اترنے والا امریکن سونا جو بقول اس کے غریبوں کا پردہ امیروں کی شان ہے۔ صابن اور کریمیں جس سے ہر ہندوستانی عورت، پری چہرہ فرنگن کی مانند گوری چٹی بن سکتی ہے۔ ممیرے کا سرمہ جادو کی انگوٹھی اور گندی دوائیں بیچنے لگا۔ ہر ایک کی تعریف کے پل باندھ دیئے اس کے بعد ان چیزوں کو بیچنے کی کوشش کی۔ زور دیا۔ التجا کی۔ پھر بھی جب ناکام رہا تو مایوس نظریں ادھر ادھر دوڑا کر دوسرے ڈبے کی طرف لپک گیا۔

میں سادہ اور سنجیدہ نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دماغ پر زور دے رہا تھا کہ میں نے اسے اپنے دوست راجندر کمار کھنہ کے ساتھ ہی تو نہیں دیکھا تھا۔ نیلی وردی والا قلی اپنے کالے سفید بھورے بالوں کی کھچڑی ڈاڑھی مونچھوں کو زرد لیس دار دانتوں سے کاٹ اور چبا رہا تھا۔ میری دائیں طرف بیٹھی ہوئی بڑھیا نے ہڈیوں کے ڈھانچے سے پوچھا "بھیا کیا تم بیمار ہو؟"

اس نے اپنے دائیں بازو کو بڑے آہستہ سے اوپر اٹھایا۔ اور درمیانی انگلی سے اپنی بھوؤں کو کھجانے لگا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ گنگنایا "ہندوستان میں کون بیمار نہیں۔ بہن یہ بیماری تو زندگی کی نشانی ہے۔ زندگی کی نشانی۔ جب دم ہی نہ ہو تو بیماری کیا خاک ہو گی" اس کے بعد وہ کھوکھلی، مذاق سے خالی ہنسی ہنس

ہچکولے کھانے لگا۔

یتیم لڑکے نے صندوقچی کو کھٹکھٹا کر پھر چلانا شروع کیا "پیارے بھائیو! پیارے بچو! آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اناتھوں کا یتیموں کا کیا حال ہوتا ہے۔ کبھی یہ بھی لال ماں باپ کے۔ آج ہیں یہ محتاج آپ کے۔ کبھی یہ دھن وان تھے دولت والے تھے۔ سکندر جب چلا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔ آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں۔ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں۔ سراسر سونا بھرا تھا لنکا کی دیوار ہیں۔ ایک رتی سونا نہ ملا راون کو مرتی بار ہیں۔ جگ میں مٹھی باندھے آئے تھے، ہاتھ پسارے جاؤ گے۔ نہ کچھ ساتھ لیکر آئے تھے نہ کچھ ساتھ لیکر جاؤ گے"

دائیں طرف کے کونے میں جھگڑے کی آوازوں کا شور یکایک تیز ہو گیا۔ ایک مسافر نے اپنے ٹرنک کو اوپر تختے پر پڑے ہوئے بستر ے پر ایسے اٹکا رکھا تھا کہ اس کے گرنے کا ہر وقت احتمال تھا۔ اور نیچے بیٹھا ہوا مسافر اس پر اعتراض کر رہا تھا کہ اگر ٹرنک گر پڑا تو اس کی گردن ٹوٹ جائیگی۔ ٹرنک والا یہ رٹ لگاتے جا رہا تھا کہ اگر اسے اپنی گردن کی اتنی فکر ہے تو نیچے سے اٹھ جائے، وہ خود وہاں بیٹھ جائیگا۔ ابھی یہ جھگڑا ختم نہیں ہوا تھا کہ دوسری طرف شور مچنا شروع ہو گیا۔ ایک کوڑھی لولا شخص وہاں نیچے فرش پر ہی بے احتیاطی سے تھوکے جا رہا تھا اور دوسرے مسافر اس سے کھڑکی کے باہر تھوکنے کیلئے کہہ رہے تھے۔ لیکن وہ بالکل نہیں مانتا تھا حتیٰ کہ ایک شخص نے کان پکڑ کر اس کا سر کھڑکی سے باہر نکال دیا۔ اور وہ زور زور سے رونے چیخنے اور گالیاں دینے لگا۔

پھر تو تو میں میں شروع ہوئی۔ پولیس کے سپاہی سستی بیڑیوں کے لمبے لمبے کش لگا کر دھوئیں کے بادل اگل رہے تھے۔ ناک منہ سے دھوئیں کا بادل نکل رہا تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی آنکھوں تک سے دھواں نکل رہا ہے۔ ڈبہ میں

انتہائی بھیڑ ہونے کی وجہ سے بڑا گھس تھا۔ بیڑیوں کا کڑوا دھواں اندر ہی چکر کاٹنے لگا۔ جس سے دم اور بھی گھٹ رہا تھا۔ ایک سکھ نے سپاہیوں کو بیڑیاں پینے سے منع کیا لیکن وہ نہ ملنے۔ الٹا اسے ڈانٹنے لگے۔ اس پر ایک اکالی جو خاموشی سے گٹھڑیوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ باہر نکل آیا۔ کچھ دیر گرما گرم بحث ہوئی اور سپاہیوں نے بیڑیاں باہر پھینک دیں۔ ایک مسافر نے کہا "سردار جی آپ جتنی نفرت تمباکو سے کرتے ہیں اگر انگریزوں سے کرتے ہوتے تو نہ یہ فرنگی رہتے اور نہ ان پولیس والوں کی اکڑ۔"

میں نے ایک جمائی لی اور پھر مسافروں کے چہرے پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ مختلف لوگوں کے بے جان، بے حس چہروں پر اونگھتی ہوئی پریشانی میرے ذہن میں مختلف قسم کے جذبات کو سہلانے لگی۔ میری پیٹھ کے پیچھے بیٹھے ہوئے دو مسلمان اس بات پر پُر زور بحث کر رہے تھے کہ یہ چاوڑی بازار، ہیرا منڈی اور دوسرے بازارِ حُسن عموماً ہر شہر میں وہاں کی جامع مسجد کے قریب ہی کیوں ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک موٹا بوڑھا مارواڑی اور اس کی نوجوان بیوی بیٹھی ہوئی تھی۔ بیوی کی ہاتھی دانت کی سُرخ چوڑیاں اس کے نئے سُہاگ کی گواہی دے رہی تھیں۔ پوچھنے پر سیٹھ جی نے بتایا کہ ان کے ہاں کوئی لڑکا نہیں جس لئے دوسری شادی کرنا پڑی۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا اس کے ہاں پہلی بیوی سے کوئی بچہ پیدا ہی نہیں ہوا تو اس نے بڑے گھریلو انداز میں جواب دیا کہ اس کی پہلی بیوی کے ہاں بچے تو ایسے پیدا ہوتے ہیں جیسے مشین سے کھلونے نکلتے ہیں لیکن کوئی زندہ نہیں رہتا۔ دوسری طرف کی کھڑکیوں کے قریب ایک دھوتی پوش جہاتئے بڑے ہمدردانہ اور دوستانہ انداز میں ہر ایک کے حالات پوچھ رہا تھا۔ ہر ایک کے ساتھ ہمراۓ ہو رہا تھا۔ ہر ایک پر ہمدردی اور شفقت برسا رہا تھا۔ بغیر جواب کی امید

یا انتظار کے ہر ایک سے سوال کر رہا تھا۔ اس کی ان سب حرکتوں میں ایک بے بس مشینی پابندی اور باضابطگی تھی۔

وہ سنجیدہ سادہ نوجوان اس بحث ومباحثہ کے شور و غوغا سے غیر متاثر، کھڑکی کے باہر ابھی ابھی نکلے ہوئے چاند کی روشنی میں بھاگتے جاتے تار کے کھمبوں اور لہروں کی طرح اونچے نیچے حرکت کرتے تاروں کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھا۔ پھر مجھے اپنے دوست راجندر کمار رکھنہ کا خیال آیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ مجھے اُسے ڈھونڈھنے کی کچھ اور کوشش کرنی چاہیئے تھی۔ گھر کے پتے پر پوچھ کر لوٹ آنا کافی نہیں ہونا چاہیئے تھا۔

یتیم لڑکا اپنی طرف کسی کو متوجہ نہ دیکھ کر آگے سرک آیا۔ اور ایک ٹرنک پر کھڑا ہو کر زور زور سے چیخنے لگا! "آپ بھائیوں کو معلوم ہوگا کہ ایک فقیر چار گھر مانگ کر پیٹ بھر سکتا ہے، ایک ودھوا چار گھر مانگ کر اپنا پالن کر سکتی ہے۔ لیکن یہ چھوٹے چھوٹے بچے آپ بھائیوں کے پیسے سے پرورش پاتے ہیں۔ جہاں آپ سیکڑوں روپئے اپنے بچوں کیلئے خرچ کرتے ہیں، دو چار آنے تو آپ پان بیڑی کھا کر تھوک دیتے ہیں ان بچوں کو ایشور کے نام پر دینا کوئی بڑی بات نہیں۔"

وہ لڑکا گراموفون کے ریکارڈ کی طرح چلّائے جا رہا تھا۔ ایک طرّے دار پگڑی والے بلوچ نے اسے چلّانے سے پہلے بھی روکا تھا۔ اب اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا کان مروڑا اور طمانچہ دکھا کر اسے خاموش رہنے کیلئے کہا۔ یہ سب کچھ اس نے اس دہشت انگیز طریقے سے کیا کہ یتیم لڑکا سہم کر خاموش ہو گیا۔

دائیں طرف دروازے کے قریب پھر جھڑپ شروع ہوئی۔ وہی ٹرنک کو اوپر رکھنے کا جھگڑا تھا۔ اس دفعہ ایک، دو گھونسوں کا تبادلہ بھی ہوا۔ ایک شخص نے کہا "اس ٹرنک کو بیت الخلا میں کیوں نہیں رکھ دیتے، بالکل خالی ہے۔" ٹرنک والا

معترض نظروں سے اس کی طرف گھورنے لگا۔ اس شخص نے دوہرایا" اس میں خفا ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہ پاخانہ گھر کے پاخانوں کی طرح گندہ نہیں "

قریب ہی بیٹھے ہوئے ایک اور مسافر نے اضافہ کیا" یہ ریل گاڑیوں کے پاخانے ہمارے گھروں کے پاخانوں سے توکیا ہندوستان کے نوّے فی صدی گھروں سے زیادہ صاف اور صحت افزا ہیں "ایک ذرا پرے کھڑے مسافر نے آگے بڑھکر چمڑے کا سوٹ کیس اٹھا کر اوپر رکھ دیا اور وہ بھاری ٹرنک اس کی جگہ نیچے۔

ایک کرسٹی ٹوپی والا مسافر دروازے کے پاس کھڑا تھا ہمارے قریب آبیٹھا۔ اور پیشتر اس کے کہ کوئی اعتراض کرے وہ بڑھیا سے پوچھنے لگا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟"

"دہلی۔ سہارنپور گاڑی بدلنا ہے نا؟" بڑھیا نے جواب دیا۔

اس کے پوچھنے پر وہ اپنی کہانی سنانے لگی کہ اس کا لڑکا دہلی کے کسی مل میں ملازم ہے۔ پچھلے چار مہینوں سے اسے تنخواہ نہیں ملی۔ اور اب وہ سخت بیمار ہے۔ نہ گھر لوٹ آنے کیلئے اس کے پاس کرایہ ہے اور نہ کوئی نوکری ملتی ہے۔ اب مجھ سے نہیں رہا گیا۔ خود چلی آئی ہوں" یہ کہتے کہتے بڑھیا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"اس کا باپ کیوں نہ آیا؟" اس نے پھر ہمدردی کا اظہار کیا۔

بڑھیا اپنے آنسو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب نہ روک سکی اور وہ ان ٹپکتے آنسوؤں میں رک رک کر بڑبڑانے لگی" شہید گنج کا فساد ہوا تھا نا۔ تین دن کام پر نہ گئے۔ آخر جانا پڑا۔ خوانچہ لگائے بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی نے چھرا گھونپ دیا"

ہڈیوں کے ڈھانچے نے ایک چھوٹی سی پڑیا کو منہ میں ڈالتے ہوئے کرسٹی ٹوپی والے سے کہا" جانتے ہو یہ کیا ہے؟ اس سے کوڑی کا پان یا پچر و پئے کا بن جاتا ہے" ابھی اس نے جواب بھی نہ دیا تھا کہ ہڈیوں کے ڈھانچے نے پھر اس کی گردن پر لٹکتے

ہوئے سے مٹّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا: "یہ کیا ہے؟"

"چھوٹی ٹیشن میں غلطی سے ایک گائے کی گردن پر تھوک دیا تھا اس کی وجہ سے نہیں ہے۔"

میرے پیچھے بیٹھا ہوا مسلمان نوجوان اپنے دوست سے کہہ رہا تھا کہ کل لاہور میں مولانا حمید الدین کا بڑا شاندار جلوس نکلا۔"

ہڈیوں کے ڈھانچے نے جلدی سے گردن اُدھر گھمائی اور بڑے جوش سے بولا:۔

"جلوس تو بھئی سب کے نکلتے ہیں کسی کا مرنے سے پہلے کسی کا مرنے کے بعد!" پھر اسی کھوکھلی مذاق سے خالی ہنسی میں ہچکولے کھانے لگا۔

کرسٹی ٹوپی والے نے پٹیالوی ٹوپی والے سکھ نوجوان سے سوال کیا: "سردار جی! آپ کیا کام کرتے ہیں؟"

"تلاشِ روزگار!" سکھ نوجوان نے ذرا پس و پیش کے بعد کہا: "کوئی جگہ خالی نہیں۔ ابھی سول سرجن لاہور کے دفتر میں ۷۲ روپے ماہوار کی نوکری کیلئے انٹرویو کر کے ناامید لوٹ رہا ہوں۔"

"آپ شکل و لباس سے تو خوش حال معلوم ہوتے ہیں۔ کوئی کاروبار کیوں نہیں کر لیتے؟"

"خوش حال! ابھی انٹرویو کیلئے مخصوص سوٹ شاید میری کُل پونجی ہے۔"

دوسری طرف کی نشستوں پر بیٹھا ہوا مسافر یکایک بول اٹھا: "کاروبار کی بھلی کہی۔ یہ بھی ایک جُوا ہے۔ کاروبار کرنیوالے کنگال ہوتے جاتے ہیں اور کاروبار کرنے والے لکھ پتی اور کروڑپتی بنتے جاتے ہیں۔" پھر وہ اپنی آپ بیتی سنانے لگا۔ کیسے وہ لاہور میں دو سال میں کئی سو روپیہ اس کاروبار کے جھنجٹ میں اُڑا کر آرہا ہے۔ کیسے وہ ہمیشہ بدقسمت ہی رہا ہے۔ کیسے اس سے بے انصافی ہی ہوتی رہی ہے۔

ایک قریب بیٹھے ہوئے مسافر نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا "پرماتما پر بھروسہ رکھو۔ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔"

سادھو نے جو اس کے قریب سرک آیا تھا آہستہ سے کہا "جس ملک میں بھک منگوں کو پیٹ بھر روٹی نہیں ملتی اس میں اور کون سکھی ہوگا؟"

میرے دائیں طرف بیٹھی ہوئی غریب عورت جس کی گود میں اس کے دو بچے لیٹے تھے، اپنی سیٹ پر بیٹھی ایک عورت کو اپنی رام کہانی سنا رہی تھی کہ کس طرح مہتروں کی ہڑتال میں اس کے خاوند کو بلوہ کرنے کے الزام میں پانچ سال قید ہوئی اور کس طرح اس نے چھ مہینے کی محنت مزدوری کے بعد اس سے لاہور ملنے جانے کیلئے کرایہ کے پیسے اکٹھے کئے اور کیسے وہ اب بھوک اور دکھ کے دن گذار رہی ہے۔"

دائیں طرف کھڑکی کے قریب پھر گالیوں، چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جمیعدار کا سوٹ کیس نیچے گر پڑا تھا۔ اور نیچے بیٹھے ہوئے مسافر کے سر پر سخت چوٹ آئی تھی۔

جالندھر کا اسٹیشن قریب آتا جا رہا تھا۔ یتیم لڑکے نے طرے دار پگڑی والے کی منت سماجت کرکے گانے کی اجازت لی۔ اور پھر اپنا پرانا سبق زور زور سے جلدی جلدی رٹنے لگا۔ اور بعد میں صندوقچی کھٹ کھٹا کر رسید بک ہاتھ میں پکڑ چندہ مانگنے لگا۔

جب وہ یتیم لڑکا اس مسافر کے قریب پہنچا جس کے چوٹ لگی تھی تو وہ اس سے بڑے روکھے پن سے پوچھنے لگا "کیا بات ہے؟"

"بابو یتیم ہوں۔" اس لڑکے نے التجا کی۔

"تو کیا ہم یتیم نہیں، دیکھتے نہیں ہو ہماری حالت، پیسے خرچ کئے ہیں پھر بھی کوئی پوچھنے والا نہیں۔" اس نے کرخت لہجہ میں کہا "بھیا ہم چالیس کروڑ غلام سب یتیم ہیں۔" اس کی آواز دفعتہً نرم ہوگئی۔

میں اس غریب عورت کی گود میں لیٹے ہوئے دو بچوں اور چودہ روپئے ماہوار

تنخواہ پانے والے قلی کے سات بچّوں کی طرف دیکھ کر سوچنے لگا کہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی تو یہ بچّے یتیم ہی تو ہیں۔ ان کے والدین میرے والدین کی طرح اپنے بچّوں کیلئے کر ہی کیا سکتے ہیں۔"

سنجیدہ نوجوان کی خاموشی کو توڑتے ہوئے کرسٹی ٹوپی والے نے پوچھا:۔

"جناب کہاں جا رہے ہیں؟"

"انبالے۔"

"اور یہ آپ کی بیوی اتنی غمگین کیوں ہیں؟"

"میری بہن ہے۔ بیوہ بہن۔" یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور لڑکی کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو ٹپکنے لگے۔ اور اس نے آنچل سے اپنے منہ کو چھپا لیا۔" نوکری چھوٹ جانے کے بعد اس کا خاوند گھبرایا ہوا گھر لوٹ رہا تھا۔ ایک شراب میں مدہوش پولیس آفیسر کی موٹر کے نیچے آکر اتنا زخمی ہوا کہ ہسپتال پہنچنے سے پہلے جان نکل گئی۔" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"کیا نام تھا اس کا؟" میرے منہ سے بے تابی کے عالم میں نکل گیا۔

"راجندر کمار کھنّہ!"

"راجندر کھنہ ———!" میری نبض کی دھڑکن رُک گئی۔ ناگہانی غم نے مجھے بالکل بے حس اور ساکت بنا دیا۔ آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے اور میں نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ پے در پے ضربیں۔ اب یہ دُکھ سُکھ کا دوست ——— شدّتِ غم سے میرا دل تلملا اٹھا۔

اس المناک نیم حسی سے مجھے گیبرڈین کی پتلون والے نوجوان نے بیدار کیا "بڑا دردناک افسانہ ہے۔" اس نے میری کتاب واپس کرتے ہوئے کہا۔

ہسپتال میں

دن اُداس، کاہل، سُست گام ـــــ پُر کوفت بے رحمی سے مغز چاٹ رہا تھا۔ کوئی اسے کھینچ کر لمبا ہی لمبا کئے جا رہا تھا۔ اس ربڑ کے بنے ہوئے دن کو۔ ـــــ کبھی ختم بھی ہوگا یہ دن ـــــ یہ بوند بوند ٹپکتا ہوا پانی۔

وسیع صاف واضح خاکے اور ان میں غیر مبہم ٹھوس پرچھائیاں آہستہ آہستہ روشن ہو گئیں۔ بہت پرانی، بہت دور کی یادیں جو وقت کی لہروں کے ساتھ بہہ کر نظر سے اوجھل ہو چکی تھیں۔ بیتی ہوئی خوشی کے چند سُبک رو ثانیے ـــــ میری آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ کسی اور ہی دُنیا کی کہانی۔ اس بسترِ مرگ پر بھی کیوں چٹکیاں لیتی ہیں۔ رہ رہ کر تڑپاتی ہیں یہ ظالم یادیں ـــــ

گھڑی نے ابھی ساڑھے دس ہی بجائے تھے۔ بستر نمبر اکتیس کا مریض دس بجکر پانچ منٹ پر فوت ہوا تھا۔ اور یہ پچیس منٹ مجھے پچیس برس سے بھی زیادہ طویل معلوم

ہو رہے تھے۔ ابھی اس کی لاش سامنے کھڑکی میں سے نظر آتی ہوئی مُردہ گاڑی میں پڑی ہوئی تھی۔ مجھے بھی محسوس ہونے لگا کہ میں مرنے والا ہوں، بہت جلدی زندگی کی بچی کھچی گھڑیاں پھیل کر مجھے بے حد طویل دکھائی دینے لگیں۔ میرے ذہن پر یہ یقین غالب آتا دکھائی دے رہا تھا کہ قیامت آنے والی ہے۔ چار یا پانچ صد سالوں یا صدیوں کے غیر معین عرصے کے بعد نہیں بلکہ کل ٹھیک اسی وقت پر ــــــــــ دس بجکر اکتیس منٹ پر۔

اس سے ایک دن پہلے میں ہسپتال میں داخل ہوا تھا۔ ہر وقت پیٹ میں شدید درد رہتا تھا۔ رسولی یا تپ دق کے غدود کا شبہ تھا۔ ایک دوست کی سفارش ایکس رے معائنہ کیلئے داخل کیا گیا تھا۔ تپ دق وارڈ کی مرمت ہو رہی تھی۔ وہاں کے مریضوں کو دیگر وارڈوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ اس وارڈ میں سل کے دو اور مریض تھے۔ ایک شاہی نظر بند جسے گیارہ سال بعد جاں بلب ہونے پر ہسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔ دوسرا گو عمر رسیدہ نہیں تھا لیکن بہت بوڑھا دکھائی دیتا تھا۔ ریلوے ورکشاپ میں رات کی ڈیوٹی پر سکہ پگلانے سے اس کے پھیپھڑے چھلنی ہو چکے تھے۔ میری دائیں طرف وہ دونوں تھے۔ اور بائیں طرف دوسرے تیس چالیس مریضوں کے بستر ے۔

سامنے جم بیری کے ٹنڈ منڈ پیڑ کی سوکھی بے برگ و بار ٹہنی کمرہ کے اندر جھک آئی تھی۔ اور اس سے لٹکی ہوئی ننھی ننھی سُرخ ترنجیاں موت کے فرشتے کے بے رحم ڈیلوں کی طرح مریضوں کی طرف وحشت خیز ٹکٹکی لگائے ہوئے تھیں چھت کے شہتیروں میں پناہ گزین نیلے ڈنڈ کھلے کبوتر گردنیں پھیلا کر اور سکیڑ کر غٹرغوں سے ماتم کر رہے تھے۔

کہا جا رہا تھا کہ دو دن سے وارڈ میں کوئی ڈاکٹر نہیں آیا تھا۔ اور اس سلسلے

میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ عموماً ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔ کبھی کسی افسر کے ہاں تیمارداری۔ کبھی کسی دوست کے ہاں حاضری۔ کبھی شہر میں فیس لیکر مریضوں کو دیکھنے۔ کبھی ٹینس، کبھی نرسوں کے ساتھ سینما ــــــ صرف چند منٹوں کے لئے ان کی وارڈوں میں سے بھاگتی ہوئی شکل دکھائی دیتی تھی۔ انتہائی سُرعت اور تیزی سے، بندوق سے چھوٹی ہوئی گولی کی طرح ــــــ اور بدنصیب مریضوں کو موت کے ساتھ ڈاکٹروں کا انتظار بھی کرنا پڑتا تھا۔

بستر نمبر سات کا مریض خود ہی ٹانگ سے پٹی کھول کر زخم سے پیپ نکال رہا تھا، میلی غلیظ پٹی جو خون اور پیپ سے سُرخ زرد ہو رہی تھی۔ ایک نیم پاگل مریض کمرہ کے آخر میں لیٹا سمع خراشی کر رہا تھا۔ یکایک وہ بستر سے اُتر کر فرش پر لیٹ گیا۔ اور مسلسل کروٹیں لینے لگا۔ سب مریض تالیاں بجانے اور ہنسنے لگے۔ ایک لڑکا جس کی خمیدہ کمر کو سیدھا کرنے کیلئے اُسے آہنی شکنجے میں باندھا ہوا تھا۔ چمڑے کی پیٹیوں اور آہنی اسپرنگوں کی رگڑ سے اس کے جسم پر گہرے زخم پڑ چکے تھے۔ اور وہ ہر وقت چیختا چلاتا رہتا تھا۔ وہ بھی ان قلابازیوں کو دیکھ کر ہنسی ضبط نہ کر سکا اور کھل کھلا کر ہنسنے لگا۔

ایک مریض رستم حیات خاں جسے بظاہر آرام ہو چکا تھا رشوت دیکر ہسپتال سے اخراج میں تاخیر کروا رہا تھا۔ اگرچہ وہ ہم سے کہا کرتا تھا کہ ڈاکٹر عیش بہادر کی لڑکی اس کے عشق میں گرفتار ہو چکی ہے اور وہ مجھے ہسپتال سے باہر نہیں جانے دیتی۔ وہ عموماً وارڈ میں چہل قدمی کرتا رہتا تھا۔ اس نے نیم پاگل مریض کو اٹھا کر بستر پر لٹا دیا۔ اور پھر چہل قدمی میں مشغول ہو گیا۔

میری دائیں طرف شاہی اسیر کے پاس آ کر وہ پوچھنے لگا ”کس خیال میں ہو،

اومسٹر۔ جنرل وارڈوں کے مریضوں کے نام سے پہلے کسی تعظیم کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ اس شاہی اسیر نے نبض، حرارت اور خوراک کے نقشوں میں سب کے نام کے ساتھ مسٹر لکھ دیا تھا۔ اس لئے تمام مریض اسے اومسٹر پکارتے تھے۔ وہ آنکھیں موندے لیٹا ہوا تھا۔ اتنی زور سے آنکھیں موندے ہوئے کہ اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کے گہرے خول کسی اندھے کی آنکھوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ اس کا منہ بھنچا ہوا تھا۔ گال پچکے ہوئے تھے۔ اس نے انتہائی کوشش کے ساتھ آنکھیں کھولیں۔ "انسانی زندگی کا کیا مقصد ہے آخر۔ ہسپتال میں اس کے سوائے اور کیا سوچ سکتا ہوں یار" وہ گردن اٹھاتا ہوا بڑبڑایا۔

رستم حیات خاں کھرچھکا کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ ہسپتال کے باورچی خانہ سے وہ چینی پھانک کر آیا تھا۔ اور بلوری دانے اس کی مونچھوں میں چمک رہے تھے۔ اس نے فرش پر کبوتروں کی بیٹ کے گرد چیونٹیوں کے دائرہ کی طرف اشارہ کیا۔ اور دائیں ڈھیری آنکھ پھڑپھڑا کر اسے پاؤں سے مسلنے لگا "یہی زندگی ہے" بے پرواہ ہو کر وہ شہتیروں میں غٹرغوں کرتے ہوئے کبوتروں پر کنکریاں پھینکنے لگا۔ اور پھر قدر افزائی کیلئے میری طرف دیکھنے لگا۔

شدّتِ احساس سے میری زبان سِل رہی تھی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا صرف اس کی طرف پھیکی بے احساس نظروں سے دیکھنے لگا۔ تکتی رام ریلوے ورکشاپ کے کاریگر نے اس کی طرف کروٹ لیتے ہوئے ہاں بھری " واہ واہ ھــزار کی ایک ہی کہی "

" اگر تم واہ واہ نہ کہو تب بھی یہ سچ ہے "، رستم حیات یکایک چڑ گیا "یہ ظاہر ہے کہ ہمیں بیوقوف پیدا کرنے کے لئے تکلیف نہیں کرنی پڑتی۔ وہ خود بخود اُگ آتے ہیں ستو مجھ جیسے آدمی درختوں کی تعداد میں پیدا نہیں ہوتے" اس نے مجھے مخاطب کیا

نرس میری اور ہسپتال کی پالتو بلی وارڈ میں داخل ہوئے۔ بلی دیکھتے ہی کئی مریض میاؤں میاؤں کی آواز نکال کر اسے اپنی طرف بچکارنے لگے۔ اور وہ ایک بستر سے دوسرے بستر پر پھدکنے لگی۔ مس میری بلی سے بھی زیادہ دبے پاؤں قدم رکھتی تھی۔ بالکل آہستہ آہستہ ازحد احتیاط سے جیسے سب مریض گہری نیند سو رہے ہیں۔ اور اسے ڈر ہے مبادا ان کی نیند اُچٹ جائے۔ وہی ایک نرس تھی جو ہسپتال میں شوق اور دلجوئی سے کام کرتی تھی۔ اس لئے وہ بہت مقبول تھی۔

ہسپتال کے بیچ میں ایک کھلا میدان تھا جس میں رسم افتتاح کے موقع پر خوبصورت باغیچہ لگایا گیا تھا۔ اب وہ گڑھوں اور چھوٹے بڑے ٹیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ تمام کوڑا اور گندگی وہاں پھینکی جاتی تھی۔ اس وجہ سے ہسپتال میں مچھروں، مکھیوں کیڑے مکوڑوں، مینڈکوں، بچھوؤں کی چھاؤنیاں لگی رہتی تھیں۔ چنانچہ جو مریض بھی ہسپتال میں داخل ہوتا تھا وہ ضرور ملیریا کا شکار ہو جاتا تھا، خواہ اس قسم کی بیماریوں کا موسم ہو یا نہ ہو۔

اس جراحی کے وارڈ میں چوتھائی سے زائد مریض ملیریا میں گرفتار ہو رہے تھے۔ مس میری نے ان مریضوں کو دوا پلائی۔ ایک نئے مریض نے چسکی لیکر تھوڑی سی دوا پی۔ پھر اسے فرش پر پھینکتے ہوئے شکایتاً کہنے لگا "میم صاحب! یہ کونین تو کڑوی نہیں!"

اس پر تمام مریض کھل کھلا کر ہنسنے لگے "پگلے ہسپتال کی کونین کڑوی نہیں ہوتی" ایک نے سمجھایا۔

او مسٹر، مس میری کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھا۔ وہ دوسرے تپ دق کے مریض سے کہنے لگا "شاید میں آج ہی مرجاؤں۔ ہاں آج ہی۔ اور میرے ساتھ بہت سی تمنائیں بھی مرجائیں گی۔ میں نے اپنے آپ کو زندگی کی تمام لذتوں سے محروم

رکھا اور ملک و قوم کیلئے دُکھ جھیلنا اپنا فرضِ اوّلین سمجھا۔ گیارہ سال کی نظربندی سمجھتے ہو اس کا کیا مطلب ہے۔ میں اب تک سیدھے مگر دشوار گذار راستے پر چلتا رہا ہوں۔ میں نے آج تک کسی عورت کو چھوا تک نہیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ یہ سب کیا ہے ـــــــ یہ عورت۔ اس کے ہونٹ۔ اس کا چہرہ۔!"

رستم حیات خاں اس کے سرہانے کھڑا آم چوس رہا تھا۔ بغیر خیال کئے کہ چھلکا نیچے سے پھٹ چکا ہے اور آم کا رس اومسٹر کے بالوں میں ٹپک رہا ہے۔ اس کو سامنے آ کھڑا ہوا اور بے حد رازدارانہ لہجے میں کہنے لگا "ہم یونہیں مارے مارے پھرتے ہیں! ہمارے بغیر تو یہ عورتیں ایسے مر جائیں جیسے ان مچھروں کے انڈے پانی کے بغیر" اس نے جھپٹّا مار کر مچھر پکڑا اور اسے انگلیوں میں مسلنے لگا "دوست! تم عورت سے ناواقف معلوم ہوتے ہو۔ اور میں نے ساری عمر انھیں انگلیوں پر نچاتے گذاری ہے۔ ڈاکٹر عیش بہادر کی لڑکی یونہی نہیں پھنس گئی"

ایک مریض تمام دن چڑچڑ کرتا رہتا تھا۔ ہر ایک سے دن میں دس دس دفعہ لڑتا۔ اور فوراً ہی صلح کر لیتا۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اس کی زبان غیر معمولی طور پر لمبی اور تیز ہے۔ وہ بستر پر بیٹھے ہوئے کہنے لگا "عورت کا چہرہ تو دُنیا میں سب سے نکمّی شے ہے۔ گلاس میں ہم پانی پی سکتے ہیں۔ اس بستر پر لیٹ سکتے ہیں۔ لیکن عورت کا چہرہ تو قطعی غیر مفید ہے۔ بس اسے تکتے رہو!"

مس میری اب ہماری طرف بڑھ آئی تھی۔ اس نے شکتی رام کا ہاتھ پکڑ کر مُنہ اپنی طرف کیا۔ اور وہ اس میں دوا اُنڈیلنے لگی ہی تھی کہ شکتی رام نے پُڑیا اس کے ہاتھ سے چھین لی۔ اور سفوف کو انگلیوں میں مسلتے ہوئے کہنے لگا "میم صاحبہ! آج پھر وہی چاک کھڑیا مٹی ـــــــ رتّی بھر کیلشیم نہیں۔ ابھی کل شام چائے بسکٹ کیلئے روپیہ دیا تھا۔ میرے بیوی بچّوں پر ہی رحم کھاؤ!" اس نے سفوف چلچی میں پھینک

دیا۔ اور وہ تمام کا تمام پانی کی تہ میں بیٹھ گیا "دیکھو رتی بھر کیلشیم نہیں" اس نے چلمچی کی طرف اشارہ کیا۔

اومسٹر کیلئے وہ پچکاری تیار کرلائی تھی۔ بازو ننگا کر کے اسپرٹ لگا کر سوئی گھونپنے لگی ہی تھی کہ وہ پچکاری ہاتھ میں لیکر اسے روشنی میں جھلجھلانے لگا "دیکھو آج پھر نرا پانی ہے" اس نے مس میری سے التجا کی "ہفتہ میں ایک مرتبہ تو پچکاری میں دوا ڈال لیا کرو" نرس نے پچکاری لے کر سوئی اس کے بازو میں گھونپ دی۔

رستم حیات خاں حسب معمول وارڈ میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ اس کے رخساروں کی ابھری ابھری چپٹی ہڈیاں نئی حجامت کی وجہ سے نیلی ہو رہی تھیں۔ اس کی ابھری ہوئی بیضوی کھوپڑی پر ترا شئے ہوئے بھورے بالوں میں زخم کا نشان نظر آ رہا تھا۔ جس سے وہ مُشک کی تھیلی کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بادی النظر میں بے رنگ معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن ان میں عجیب قسم کی چمک تھی۔ جب وہ آنکھیں جھپکتا تو پتلیاں بغیر پلکوں کے ملے حرکت کرتیں۔ جس سے اس کا چہرہ خوفناک ہو جاتا۔ اس کا مُنہ بہت چھوٹا تھا۔ اس کے موٹے موٹے ہمیشہ پھڑپھڑاتے رہنے والے لب ایک دوسرے سے جُدا رہنے پر بضد تھے۔ اور ان میں انگلیوں سے نوچ کر چھدری کی ہوئی مونچھیں حائل رہتیں۔ اس کے کان انتہائی بدنما طور پر کھوپڑی سے چمٹے ہوئے تھے۔ ہسپتال کے پُر ملال ماحول کو اس کی موجودگی نے گھناؤنا بنا رکھا تھا۔

نرس کے چلے جانے پر تمام مریض ڈاکٹروں اور ہسپتال کے عملے کو کوسنے لگے۔ سب وثوق کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ یہ شیطان کے کارندے ہیں اور دوزخ میں جائیں گے۔ مرے ہوئے انسانوں کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں گدھوں کی طرح۔ بے رحم درندے۔

ایک مریض جس کی ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں دائیں آنکھ زائل ہو گئی تھی۔ اور

جس کی ٹانگیں بیراکالی تحریک کے سلسلہ میں مرطوب کوٹھڑی میں مقید رہنے کی وجہ سے گٹھیا کا شکار ہو چکی تھیں۔ پچھلے ایک مہینے میں اس کیلئے سولہ دوائیاں تجویز کی جا چکی تھیں۔ لیکن پینے کیلئے اسے ہمیشہ وہی پھیکا کسیلا پانی ملتا تھا۔ ہم لوگ تو کوڑی کوڑی کیلئے ایک دوسرے کو کچلنے کیلئے تیار ہیں۔ ان سیکڑوں صدیوں میں ہندوستانیوں نے کچھ نہیں کیا۔ صرف ایک دوسرے کی پگڑی اچھالی ہے۔ ایک دوسرے کا خون چوسا ہے۔ ہم اب تک چاٹنے کے لئے اوروں کے جوتوں کی تلاش کرتے رہے ہیں۔

ایک عمر رسیدہ مریض جو بھنے ہوئے چنے چبا رہا تھا دانت دکھانے لگا۔ کھی کھی کھی . . . چنے کے ریزوں سے ڈھکے ہوئے دانت نظر آنے لگے۔ وہ بہت باتونی تھا اور معمولی باتوں پر غصے سے لال پیلا ہو جایا کرتا تھا۔ لمبی لمبی کہانیاں سناتا رہتا تھا من گھڑت کہانیاں جن میں رتی بھر سچائی نہیں ہوتی تھی۔ وہ بیچ میں بول اٹھا۔ "میں سوچتا ہوں کہ اگر میں خدا ہوتا تو دن رات نجات اور جنت کیلئے تلملاتے ہوئے ہندوستانیوں سے کیا سلوک کرتا۔ انھیں پیس کر سفوف بنا کر ہوا میں اُڑا دیتا۔ ہا۔ ہا۔ ہا . . . . ہی ہی ہی" باتیں کرتے وقت اس کے ڈھیلے جبڑے بگڑے ہوئے کھلونے کی طرح بے ضابطہ حرکت کرتے دکھائی دیتے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کچھ اس انداز سے حرکت کرتے جیسے تمام کمرہ زلزلے سے کانپ رہا ہو۔ اور وہ ڈر رہا ہو کہ کہیں چھت ہی نیچے نہ گر جائے۔

رستم جیات خاں اس کے پاس آ کر کہنے لگا "تھوڑے چنے دینا یار!"

"کیوں تم کون ہو میرے؟" عمر رسیدہ مریض جھنجلایا۔

"تمھارا چچا۔ جب تم بچے تھے تو میں تمھیں گود کھلایا کرتا تھا" رستم جیات نے اس کی جھولی سے چنے چھین کر پھانک لئے۔ اس کا چہرہ غصّہ سے سکڑ کر جھرّیوں سے

بھر گیا۔ زبان کی مدد سے اس نے چھدری مونچھوں کو لبوں سے ہٹایا۔ دوسرے مریض حسبِ معمول ڈاکٹروں کی بے رحمی کی باتیں کر رہے تھے "آج شیطان نہیں آیا"۔ ایک مریض نے نیند اُچٹ جانے پر خیال کیا۔ ان کی غیر موجودگی میں کئی مریض ڈاکٹروں کو شیطان کا لقب دیا کرتے تھے "شیطان دیکھنا ہے تو جاؤ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لو"۔ رستم حیات نے تیوری چڑھائی۔

اومسٹر نے رستم حیات کو مخاطب کیا "آج میں ضرور مس میری کا منہ چوم لونگا۔ شاید یہ میری زندگی کا آخری دن ہے۔ پانی کے انجکشنوں سے خون نیلا ہو چکا ہے۔ میں ایسا محسوس کر رہا ہوں جیسے وہ میرے جسم کا ایک حصہ ہے۔ سچ کہوں ہنسنا مت۔ میں اس کے بغیر ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے سوڈا واٹر کی بوتل میں بند مکھی۔ جیسے امریکہ کے بغیر کولمبس۔ جیسے ڈارون بغیر بندر کے۔ کاش میں کچھ عرصے اور زندہ رہ سکتا"۔

شکتی رام نے کہنی کا سہارا لیتے ہوئے اومسٹر کی طرف کروٹ لی "کیا ایسے انسانی قد کے بندر ہیں جو دو ٹانگوں پر چل پھر سکتے ہیں۔ ۔ ۔ کیا سچ مچ یہ فرنگی بندروں کی اولاد ہیں؟"

رستم حیات کی آنکھیں اومسٹر کا مذاق اُڑا رہی تھیں۔ اومسٹر کے مرجھائے ہوئے لب پھڑپھڑانے لگے "اگر میں آج بیس آدمیوں کو قتل کر دوں تو بھی میرا کچھ نہیں بگاڑا جا سکتا۔ جب پولیس پکڑنے آئیگی تو میں ہنسوں گا۔۔ عقل کے اندھو! صرف چند گھنٹے اور باقی ہیں جو جی چاہے حکم سنا دو"۔

ایک مریض جس کے منہ سے ہمیشہ رال ٹپکتی رہتی تھی ہسپتال کی وردی اتار اس میں سے جوئیں نکال نکال کر ناخنوں سے کچل رہا تھا۔ رستم حیات اس کے کندھوں

کو جنبش دینے لگا" شاباش ۔شاباش !"

بارہ بجنے میں تیس منٹ تھے ۔ڈاکٹر ابھی آیا تھا ۔اور وارڈ میں چکر لگا رہا تھا'
بندوق سے چھوٹی ہوئی گولی کی طرح ۔اس کی ڈیوٹی بارہ بجے ختم ہوتی تھی ۔اس کے پیچھے
ہسپتال کی بلّی بستروں پر پھدک رہی تھی ۔

ایک مریض جس کی ٹانگ کا آپریشن ہوا تھا شدید حاجت محسوس کر رہا تھا اور
طشت چوکی کیلئے چلا رہا تھا ۔ایک اور مریض بہت شور و غل مچا رہا تھا ۔اسے سوجی
ہوئی ران پر سینک دینے کیلئے ربڑ کی بوتل ملی ہوئی تھی ۔بوتل میں سے پانی بہہ رہا
تھا اور اس پانی سے بستر بھیگ گیا تھا ۔

بہت سے دیہاتی ایک مریض کو چارپائی پر اٹھائے ہسپتال میں گھوم رہے
تھے ۔ان کے ساتھ آدھی درجن سے زائد عورتیں رو پیٹ رہی تھیں ۔ہماری وارڈ
کے برامدہ میں پہنچ کر انھوں نے چارپائی فرش پر رکھ دی ۔ڈیوٹی ختم ہو جانے کی
وجہ سے پہلا ڈاکٹر غیر حاضر تھا ۔اور دوسرا ڈاکٹر ابھی تک نہیں آیا تھا ۔مریض کی حالت
خطرناک ہوتی جا رہی تھی ۔اور اس کے ساتھ ساتھ عورتوں کی چیخیں بڑھتی جا
رہی تھیں ۔

میری نظر چارپائی کے نیچے پڑی ۔وہاں سے تھرماس بوتل جو میں ساتھ لایا تھا
غائب تھی ۔میں نے ارد گرد کے مریضوں سے پوچھا ۔سوالات کئے ۔سب کھلکھلا کر
ہنسنے لگے ۔اور بات مذاق میں پڑ گئی " یہاں تو لوگ جان سے ہاتھ دھوئے بیٹھتے ہیں ۔
ایک نے کہا " جوتے اٹھا کر بستر کے نیچے رکھ لو ورنہ یہ بھی اڑ جائیں گے " سامنے سے
آواز آئی ۔

اتنے میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا ۔خدمت گار بڑی بڑی پیالے دار
رکابیوں میں مریضوں کیلئے کھانا لانے لگے ۔مجھے اب معلوم ہوا کہ ہسپتال میں وائیں

تین قسم کی ہوتی ہیں اور کھانا دو قسم کا۔ اوّل قسم کی دوا ڈاکٹروں اور ان کے رشتے داروں کیلئے۔ درجہ دوئم کی دوا اور درجہ اوّل کی غذا ان لوگوں کیلئے تھی جو بلاناغہ ڈاکٹروں اور نرسوں کو رشوت اور خدمت گاروں کو انعام دیتے رہیں۔ دوا میں پچاس یا ساٹھ فیصدی آمیزش ہوتی تھی۔ اور غذا گو اچھی نہیں تھی مگر کھانے کے قابل تھی۔ درجہ سوم کی دوا اور درجہ دوم کی غذا عام مریضوں کیلئے تھی۔ دوا میں ۹۵ فیصدی سے زیادہ آمیزش اور غذا بے حد خراب۔

ہسپتال میں کئی مریض کچھ بھی نہیں کھاتے تھے۔ ایک مریض اپنی ترش سرخ مرچوں کی ذائقہ کی دوا ایک اور مریض کے پاس فروخت کر دیا کرتا تھا۔ وہ غذا کا بیشتر حصہ پھینک دیتا تھا۔ اور سارا دن انگوٹھا چوستا رہتا تھا۔ بہت سے مریض تجویز کردہ غذا کی بجائے ہسپتال کے باہر کی دکانوں سے چٹ پٹی چیزیں منگوا کر کھایا کرتے تھے۔ دمہ کے مریض تیل کے پکوڑوں کا لطف لیتے اور پیٹ کے درد کے بیمار تنور کی ثقیل روٹیوں کا۔ ہسپتال کی غذا آپس میں بانٹ لی جاتی۔ ہلکی غذا کے مریض گوشت کا بھی مزا چکھتے۔ اور جن کیلئے گوشت کا شوربہ تجویز تھا وہ ساتھ ہی دودھ کے چسکے بھی لیتے۔

میرے لئے سبزی کا شوربہ تجویز ہوا تھا۔ وہ میرے آگے رکھ دیا گیا۔ ہلدی نمک ملا پانی جس پر سبزی کے ٹکڑوں کی بجائے تین چیونٹیاں تیر رہی تھیں۔ لیٹے رہنے کی وجہ سے مجھے اب تک محسوس نہ ہوا تھا۔ کہ گدا بہت پتلا ہے اور لوہے کو اسپرنگ میری پیٹھ اور کمر میں دھنس گئے ہیں۔ یکایک میری کمر میں شدت سے درد محسوس ہوا۔ ایک مریض کا گدا کافی موٹا تھا۔ میں نے اس سے اپنی مصیبت بیان کی "اسے چونّی دو شام تک تبدیل کر دے گا"۔ اس نے خدمت گار کی طرف اشارہ کیا۔ اس مریض کی ٹانگ میں زہریلا پھوڑا ہونے کی وجہ سے عمل جرّاحی تجویز ہوا تھا۔

اور وہ رشوت دے کر اسے ملتوی کرائے جا رہا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اسے ڈر ہے کہ ڈاکٹر جلد بازی میں اس کی خراب ٹانگ کی بجائے ٹھیک ٹانگ نہ کاٹ ڈالیں۔ اس کی ٹانگ پر معمولی سی بال توڑ کی پھنسی نکل آئی تھی۔ مرہم پٹی کیلئے وہ ہسپتال میں آیا۔ ڈاکٹر نے اس کی طرف ایسے دیکھا جیسے اس کا وجود ہی نہیں اور وہ سامنے دیوار کی طرف دیکھ رہا ہو۔ اس نے کیفیت بتائی اور دوا لے لی۔ ڈاکٹر ہر روز اس نسخے کے نیچے دستخط کر دیتا۔ وہ ہفتہ بھر اس دوا کو ٹانگ پر لگاتا رہا اور پھنسی اچھا خاصا پھوڑا بن گئی۔ ہفتہ بھر کے بعد ڈاکٹر نے پوچھا پیٹ کے درد کا کیا حال ہے۔ جب اس نے بتایا پیٹ نہیں ٹانگ درد کرتی ہے اور پھوڑا دکھانے کیلئے دھوتی اٹھائی تو ڈاکٹر نے ایک اور نسخہ لکھ رکھا تھا۔ ایک اور ہفتہ میں حالت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ہسپتال میں داخل ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

اس وارڈ کے خدمت گار کی عمر ساٹھ ستر سال کی تھی لیکن وہ ایک سو تین سال بتایا کرتا تھا۔ ہر روز مریض اس سے سوال کرتے کہ بابا تمہاری اتنی طویل عمر ہونے کا کیا راز ہے۔ تو وہ مریضوں کو خوش کرنے کے لئے جواب دیتا کہ وہ ڈاکٹروں سے ایسے جان بچاتا رہا ہے جیسے پلیگ کے چوہے سے۔ پھر وہ داد ملنے کی غرض سے کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھنا شروع کر دیتا اور اس کی دائیں آنکھ بائیں سے بہت چھوٹی معلوم ہوتی۔

ہسپتال میں کسی مریض کے دو سے زائد ملاقاتیوں کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ اور وہ بھی زیادہ عرصہ نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ لیکن خدمت گاروں کو چند آنے انعام دیکر اس قاعدے کو نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ چند مریضوں کے رشتے دار اور واقف کار باقی مریضوں کے آرام کا پاس رکھے بغیر دوپہر سے شام تک وارڈ سر پر اٹھائے رکھتے۔ حسب معمول شور وغل شروع ہو چکا تھا۔ ایک مریض جس کی طبیعت زیادہ خراب

معلوم ہوتی تھی سمٹا کراور انگلی لبوں پر رکھ کر غل مچانے والوں کو خاموش رہنے کی التجا کرنے لگا۔ مگر بے سود۔ تنگ آکر وہ بستر پر بیٹھ گیا۔ انتہائی کوشش کے بعد پوری قوت سے چیخنے لگا "یا خدا مجھے اور زندگی کی ضرورت نہیں۔ . . . انسان کا سب سے بڑا دشمن انسان ہے . . . آدم خور . . ." اس کا گلا پڑ گیا۔ آواز بھرّانے لگی۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے سر چھت کی طرف اٹھایا "کبوتر کیا تم زندگی سے خوش ہو، ہم انسان تو نہیں۔ کم از کم یہ حیوان اور پرندے تو گناہ سے خالی ہیں۔ انسان کے سوائے باقی سب بدی سے پاک ہیں۔ صرف انسان ہی گنہگار رہے" اس نے دونوں ہاتھوں کو بھینچ کر ایک مٹھی بنالی اور اسے ٹانگوں پر رگڑ کر بے لبسی اور بے کسی کا اظہار کرنے لگا۔

بستر نمبر ۲۸ کے مریض کے گلے کا آپریشن ہوا تھا، وہ کئی روز سے بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کی ایک آنکھ کھلی رہتی تھی اور ایک بند اور ڈاکٹر بغیر معائنہ کے نقشے پر لکھ دیا کرتا تھا "حالت تسلی بخش اور عموماً سویا رہتا ہے"

یکایک اس کی گھگی بندھ گئی۔ ایک اور مریض نے اٹھ کر دیکھا کہ اس کا جسم سرد اور نبض گم تھی۔ وہ پوری قوت سے "ڈاکٹر ڈاکٹر" چلّانے لگا۔ آوازیں سن کر مس میری ادھر آ رہی تھی۔ کہ زچگی وارڈ میں اچانک کہرام مچ اٹھا۔ اور وہ اس طرف دوڑ گئی۔ وہاں ایک عورت کے بچّہ پیدا ہوا تھا۔ اور نرسیں بچّے کو پنگوڑے میں تنہا چھوڑ کر . . . . چلی گئی تھیں۔ ہسپتال کی بلّی کو آنول کھلائے جانے کی وجہ سے انسانی گوشت کی عادت ہو چکی تھی۔ اس نے نومولود بچّے کو اکیلا پا کر اس کا پیٹ چیر ڈالا۔

کچھ عرصے بعد جب مس میری اس وارڈ میں داخل ہوئی تو ادھیڑ اپنی پوشاک پھاڑ رہا تھا۔ رستم حیات نے اسے آنکھ سے اشارہ کیا۔ ادھیڑ نے چڑ چڑا کر کہا "میں

اب تمام حسرتیں ساتھ لیکر مرجانا چاہتا ہوں۔ ہم سب ظالم ہیں۔ زندہ رہ کر اپنے آپ سے ظلم کر رہے ہیں۔" وہ اور بھی شدّت سے کپڑے چاک کرنے لگا۔ اس کا جسم موم بتی کی طرح جل رہا تھا۔ اس کی ہر ایک ہڈی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ بے گوشت ہونے کی وجہ سے اس کا دھڑ بہت لمبا معلوم ہو رہا تھا۔ لمبے سوکھے بازو جن پر چمڑی اتنی تنی ہوئی تھی کہ نسوں کی پھڑپھڑاہٹ تک دکھائی دے رہی تھی۔ یہ سب بے حد ڈراؤنا تھا۔ یکایک اس نے کپڑے چاک کرنا بند کر دیئے۔ وہ چھاتی اچکا کر سب مریضوں کو مخاطب کرنے لگا: "ہم وطنو! یہ بیماریاں ہمارے جسموں میں نہیں ہماری روح میں ہیں۔ ہندوستان کی روح میں جس سے کروڑوں زندہ انسانی لاشوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ تپ دق سے بھی مہلک جراثیم۔ غربت، جہالت، غلامی کے جراثیم ہندوستان کی روح کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ اور یہ بے رحمی! ایک انسان کا دوسرے انسان سے غیر انسانی سلوک! ہمیں ان ڈاکٹروں سے پہلے روحانی ڈاکٹروں کی ضرورت ہے ـــــــ کاش ہندوستانیوں کو علم ہوتا کہ ان میں کس چیز کی کمی ہے۔"

اس کا دھڑ بستر پر گر گیا۔ اس کے جسم کا ہر حصہ انتہائی شدّت سے کانپ رہا تھا۔ وہ لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ اور اس کے لب ابھی تک الفاظ بنانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اس کا جسم لکڑی میں سے کھدا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی گردن کندھے کی ابھری ہوئی ہڈیوں میں گم تھی۔ اور ایسا دکھائی دیتا تھا کہ اس کا سر براہ راست چھاتی میں سے نکلا ہے۔ اس کی آنکھوں میں سے آنسو لڑھک کے بہے جا رہے تھے۔

میرا دم گھٹنے لگا۔ میں ایسا محسوس کر رہا تھا کہ شکنجے میں بند ہوں ـــــــ جوتے بستر کے نیچے سے نکال کر میں نے ہسپتال کے باہر کا رخ کیا۔ میرا سر گھوم

رہا تھا۔ چند لمحوں کیلئے آفتاب سیاہ ہو گیا۔ میں نے ہاتھ رگڑا ۔ کئی دفعہ آنکھیں زور سے موندیں اور تلخ گھناؤنے دھند لکے میں گھر کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔

ٹمٹماتی ہوئی قندیل
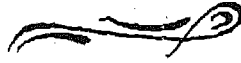
سمدھی گورا اپیشل کی سُرنگ سے نکل کر سمرہل ریلوے اسٹیشن میں داخل ہونے کی آواز سن کر آگ کو اور بھی تیزی سے ہوا دینے لگا۔ یہ گاڑی جنگی دفتر کے بابوؤں کو شملہ سے سمرہل لاتی تھی۔ وہ تینوں بابو جنھوں نے اسے ملازم رکھا ہوا تھا چند منٹ میں گھر پہنچنے والے تھے۔ اور اگر آتے ہی انھیں چائے تیار نہ ملی تو ——
وہی گالیاں اور مار پیٹ۔ سردی کی وجہ سے اس کی انگلیاں سُوج گئی تھیں ٹوٹی ہوئی ٹہنی کے خشک ٹکڑے کی طرح کُھردری اور سخت ہو چکی تھیں۔ اتنی اکڑ چکی تھیں کہ پنکھا پکڑنا تک ناممکن تھا۔ پھونکیں مارتے مارتے وہ بے دم ہو چکا تھا۔ مایوسی سے دو جمائیاں لیکر وہ ہاتھ پاؤں پھیلانے لگا۔ باورچی خانہ دھوئیں سے بھر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سُرخ رگوں کی جالی سے بھری ہوئی تھیں جس میں یہ دھواں کانٹوں کی طرح چُبھ رہا تھا۔

باہر سرد برفانی ہوا کروڑاد یوی کے برف سے سفید پہاڑ سے بار بار سر پٹک رہی تھی۔ شملہ میں موسمِ سرما کی پہلی برف باری ہو چکی تھی اور اب مطلع صاف تھا۔ بھنی کی بساندھ سے بھری دُھند پہاڑیوں سے پھسل کر وادیوں میں جا اکٹھی ہوئی تھی۔ موہنی کاٹیج کے سامنے کا بڑا میدان فٹ بھر برف سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے کنارے تیج پھل کے درخت بالکل سفید ہو رہے تھے۔ ان کے لمبے لمبے کانٹوں سے بھی برف کے گالے لٹک رہے تھے۔ سمدھی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ چاندی کے درخت ہیں اور ان سے لگے ہوئے روپیوں کو توڑ کر وہ فوراً دولت مند بن سکتا ہے۔

غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی مدھم بتّی افق کے طاقچے میں ٹمٹما رہی تھی۔ اور اس کی سرد ٹھٹرتی ہوئی شعاعیں سمدھی کے پاس چولھے تک رینگ آئی تھیں۔ اسے ان بابوؤں کے خلاف کسی قسم کی نفرت کا احساس نہیں تھا۔ لیکن وہ انھیں ایک اٹل قوت سمجھتا تھا۔ جیسے اس کے بستر کے کھٹملوں اور پسّوؤں کو اُس سے دائمی ضد تھی۔ سمدھی آگ کے ذرا اور قریب ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ لکڑی کی سیڑھیوں پر وزنی بوٹوں کے دھماکے اور برف پر چلنے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ وہ چوکنّا ہو کر بیٹھ گیا۔ آواز سُن کر باہر آیا۔ اور کمرہ کا دروازہ کھول دیا۔

بھینکی داس بابو نے پوچھا "چائے تیار ہے سمدھی کے بچّے ؟" اور جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے سمدھی کے چوتڑوں پر لات لگا کر اسے باورچی خانہ کی طرف دھکیل دیا۔

سمدھی بڑی تندہی سے آگ تیز کرنے لگا۔ اتنے میں آواز آئی "کوئی ڈاک آئی ہے سمدھی ؟" وہ "جی حضور ایک خط" کہتا ہوا خط لیکر کمرے میں پہنچا۔ وہ تینوں جھگڑ رہے تھے کہ خط میرا ہو گا۔ مگر بجلی کا بل دیکھ کر بہت مایوس ہوئے۔

"چائے نہیں لائے جانور کہیں کے" گجرمل چیں بجبیں ہو کر بولا۔

سمدھی کہنے لگا "حضور تیار کر رہا تھا کہ آپ نے آواز دے دی۔" لیکن بابو کی اُبھری ہوئی آنکھیں دیکھ کر اس کا گلا سوکھ گیا "کوئی آپ سے ملنے آیا تھا حضور" اسے یاد آگیا۔

"کیا نام تھا اس کا؟" گجرمل بڑبڑایا۔ سمدھی نے جواب دیا "اس نے نام نہیں بتایا تھا۔" وہ اور بھی گرم ہو گیا "تم نے پوچھا نہیں ہوگا الو کے پٹھے۔ انھیں اندر بٹھانا تھا" سمدھی کے منہ سے نکلنے لگا تھا "آپ کا حکم ہے ہماری غیر حاضری میں کسی کو اندر نہیں آنے دینا" مگر کان کی لو کی طرف ہاتھ بڑھتا دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گیا۔ ابھی وہ کمرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ بجبنکی داس نے دیا سلائی کی ڈبیا کیلئے آواز دی۔ جو سمدھی نے جلدی سے لاکر دے دی۔ اس میں صرف دو سلائیاں دیکھ کر اس نے ڈانٹ دی "دیا سلائیاں تک کھا جاتے ہو۔ ہفتہ میں ڈبیا ختم کر دی" اس نے لاہوریارام سے سگریٹ لیکر سلگائی۔ گجرمل دوسری سلائی سے کان کھجانے اور دانت کریدنے لگا۔

وہ تینوں شالی بابو تھے۔ اس کلرکوں کی قوم کے رکن جو مشینی کام کی وجہ سے اپنی شخصیتیں اتنی زائل کر دیتے ہیں کہ دفتر میں چپراسی تک کیلئے ان کے منہ سے اضطراری طور پر "سر" کا لفظ نکل جاتا ہے۔ اور گھر آکر چھ آٹھ گھنٹے کرسی پر جمی رہنے کی تھکاوٹ کو بیوی بچوں یا نوکر پر غصہ کی صورت میں نکالتے ہیں۔ بجبنکی داس درمیانی قد اور درمیانی عمر کا آدمی تھا۔ وہ بیوی بچوں سے کئی برس سے علیحدہ تھا۔ اٹھارہ سال کی ملازمت کے باوجود ترقی حاصل نہیں کر سکا تھا۔ اس نے اپنی لمبی سی ٹوپی پر لکھ رکھا تھا "اٹھارہ سال سے محض تیسرے درجے کا کلرک۔ تنخواہ ۹۴ روپے ۱۵ آنے"

اسے یہیں کر وہ سارا دن سرکار ہند کے دفاتر میں چکر کاٹتا رہتا تھا۔ اس کے

رخسار تھیلیوں کی طرح لٹکے ہوئے تھے اور ان پر نیلی نسوں نے میناکاری کی ہوئی تھی۔ لاہوریا رام تار کول کے گول پیپے کی طرح موٹا اور ٹھنگنا تھا۔ اس کی کولھے کی ہڈی خم کھائے ہوئے تھی۔ جس وجہ سے وہ بائیں طرف لنگڑا کر چلتا تھا۔ گجر مل کی ٹانگیں دھڑ کے مقابلہ میں بہت لمبی تھیں۔ بالکل کیمرے کے اسٹینڈ کی سی۔ ان دونوں کو جنگ کی وجہ سے عارضی کلرکی ملی ہوئی تھی۔ ان اختلافات کے باوجود وہ بالکل ایک سے تھے۔ سو فیصدی بابو۔

سمدھی باورچی خانہ میں پہنچا ہی تھا کہ گجر مل کی دھوتی کیلئے آواز آئی۔ اس نے کمرہ میں جا کر گجر مل بابو کے قریب الگنی پر پڑی ہوئی دھوتی اٹھا کر اسے دیدی۔ واپس آ کر کیتلی اٹھائی۔ اسی وقت بھینکی داس نے اسے غسل خانہ میں گرم پانی رکھنے کا حکم دیا۔ وہ جواب دینے لگا "حضور اگر کیتلی میں سے گرم پانی نکال کر رکھ دیا تو چائے بننے میں اور بھی دیر لگ جائے گی" اتنے میں بھینکی داس نے جو اس کے سر پر کھڑا تھا جلدی سے کیتلی سے تھوڑا سا پانی نکال کر غسل خانہ میں رکھ دیا۔ لاہوریا رام چلایا "میرے سلیپر کہاں ہیں جانور؟" ساتھ ہی سمدھی کو گجر مل کی کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ جب سمدھی کمرے میں پہنچا تو وہ اپنی موٹی موٹی بھویں سکیڑ کر دانت کچکچا کر مٹکا بھینچتا ہوا اسے صلواتیں سنانے لگا۔ جبڑے پورے زور سے پھیلا کر جیسے کوا چونچ کھول کر کائیں کائیں کرتا ہے۔ وہ اتنی تیزی سے چلا رہا تھا کہ اس کے الفاظ الجھ رہے تھے۔ اور پھر اتنی شدت سے کہ اس کی ناک پر عینک اچھل رہی تھی۔ آخر کار وہ سمدھی کی پیٹھ پر زور سے ٹھوکا لگاتے ہوئے چلایا۔ "الو کے پٹھے آدھ گھنٹہ آئے ہو چکا ہے ابھی تک چائے تیار نہیں ہو سکی؟"

سمدھی کے دل میں یہ لعنت ملامت دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح جلن پیدا کرتی۔ اور وہ محسوس کرنے لگتا کہ وہ سمدھی نہیں ہے بلکہ سمدھی نفی کچھ کیتلی ہلکے ہلکے

فراٹے بھر رہی تھی۔ کئی دفعہ پکارے جانے پر بھی سمدھی خاموشی سے چائے کا سامان تیار کرتا رہا۔ بالآخر چائے تیار کر کے اس نے بابوؤں کے سامنے لا رکھی۔

لاہوریا رام نے چلنے دانی کا ڈھکن اتار کر چائے سونگھی "جانور! آج چائے پھر اچھی نہیں بنائی" اس نے نتھنے پھلائے۔ سمدھی نے ہاتھ کی پشت سے ناک سے بہتے ہوئے پانی کو خشک کیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ بھینکی بابو کہتے ہیں کہ چائے کم ڈالا کرو۔ مگر سب کی غضب ناک آنکھیں اپنی طرف تنی ہوئی دیکھ کر آواز اس کے حلق میں مچھلی کے کانٹے کی طرح چبھنے لگی۔ سردی کی شدت سے اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ ان سب نے سر سے پاؤں تک اونی کپڑے پہنے ہوئے تھے اور سمدھی کے پاس جگہ جگہ سے سکی ہوئی قمیص پر کھدر کی پرانی واسکٹ تھی۔

باورچی خانہ میں پہنچ کر سمدھی نے سالن چولھے پر رکھا۔ پھر آواز پڑی۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ حتیٰ کہ وہ آوازیں چیخیں بن گئیں۔ اور اسے اندر جانا پڑا۔

بھینکی داس مونگ پھلی کو چھلکے سمیت پھانک لیتا تھا۔ اسے چند منٹ چبانے کے بعد سامنے کی طرف زور سے پھونک دیتا تھا۔ چھلکے باہر نکل جاتے تھے اور گریاں حلق کے اندر۔ اس طرح تھوڑے عرصہ میں ہی تمام کمرہ مونگ پھلی کے باریک چھلکوں سے اٹ جاتا تھا۔ گجرمل نے سمدھی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا "کاٹھ کے الو! کمرہ اچھی طرح صاف کیوں نہیں کرتا۔" لاہوریا رام نے پوچھا "میرا سوٹ تو تہہ کر کے رکھا تھا گدھے شکنیں خراب ہو رہی ہیں۔" اتنے میں بھینکی داس مچھلی کی سی گول آنکھوں کے دائرے چمکا کر، ہونٹ لٹکا کر اور دانت دکھا کر جھنجھلایا "ابے چار دن میں آدھ سیر چینی ختم کر دی۔" سمدھی نے تینوں کی طرف عاجزی سے دیکھا "حضور میرے لئے آپ نے شکر لا کر دی ہوئی ہے۔ خراب پتیوں کی چائے بنا کر اسی سے پی لیتا ہوں۔"

لاہوریارام نے بھینکی داس سے سگریٹ مانگا۔ وہ عمداً بے پروا ہوا اس کے شعلے پر پھونک مارنے لگا۔ اس کا چہرہ چمکنے لگا۔ لاہوریارام کی دوبارہ فرمائش پر اس نے سگریٹ جوتے کے تلوے سے۔ ۔ ۔ رگڑکر بجھایا۔ اور جیب میں ڈال لیا۔ لاہوریارام نے راکھ دان سے جلی ہوئی دیاسلائی اٹھائی اور اسے کترنے لگا۔ گجر مل انگلیوں کو تھوک لگاکر مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ اور پھر انھیں لبوں سے لگا لیتا تھا۔

باورچی خانہ میں آکر سمدھی نے دیا روشن کیا۔ اسے بجلی استعمال کرنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔ اندھیرا گہرا ہوچکا تھا۔ ہوا کی سیٹیوں اور قہقہوں سے معلوم ہورہا تھا کہ برف سے لدی پہاڑیوں پر قوی ہیکل دیو ناچ رہے ہیں۔ سامنے جتوگ کی چھاؤنی پر چاندماری بند ہوچکی تھی۔ لیکن اس کی آوازیں ابھی تک سمدھی کو پہاڑوں پر کوٹے لگاتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ کیل کے درختوں کی چوٹیاں نظر سے اوجھل ہوچکی تھیں۔ اور وہ بھی اونچے اونچے ڈراونے بھوتوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بندروں، لنگوروں، گیدڑوں کی ریل کی سرنگ سے آوازیں آرہی تھیں۔ رات بہت سرد اور سیاہ تھی۔ سمدھی کو بابو گنج کی سڑک کے بجلی کے قمقمے تک سردی سے کانپتے دکھائی دے رہے تھے۔ تیز ہوا کھڑکیاں کھٹکھٹا رہی تھی۔ اور چمنی میں سے نیچے کی طرف جھپٹے مار رہی تھی۔ جس سے دیئے کی بتی پھڑپھڑانے لگ جاتی تھی۔ دیواروں پر غیر واضح سائے دوڑنے لگتے تھے۔ اور سمدھی کا دل اور بھی سہم جاتا تھا۔

گجر مل نے آواز دی: "آج بوٹ پالش ضرور کرنا۔" چند منٹ کے بعد لاہوریارام نے پکارا۔ جب سمدھی کمرہ میں پہونچا تو اس کے سامنے کاپی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے پنسل کو چھڑی کی طرح سمدھی کو دکھاتے ہوئے اس دن کے خرچ کا حساب لکھانے

کا حکم دیا۔

اسی کے بعد سمدھی نے پاؤں اٹھا کر انھیں دکھائے سردی سے بالکل پھٹ اور اُدھڑ چکے تھے۔ جلے ہوئے کوئلوں کی طرح پُر شکن، سیاہ، راکھ بھرے۔ اس نے تین آنے ٹاٹ کے جوتوں کیلئے مانگے "بابو جی بہت سردی ہے مر جاؤں گا" یہ سُن کر وہ تینوں ہنسنے لگے "خبردار لڑائی کے بعد مرنا۔ آجکل تو کفن بھی مہنگا ہو رہا ہے" گجر مل نے دانت نکالے۔

سمدھی سے یہ سن کر کہ آٹا ختم ہونے والا ہے وہ تینوں یکایک چوکنے ہو گئے "ابھی تو دو روپے کا لائے تھے" کھیمکی داس نے ڈانٹا "کم کھایا کرو روپے کا تین سیر ہو گیا ہے"

سمدھی کے جواب پر کہ دس دن لائے ہو چکے ہیں لاہوریا رام نے پوچھا۔ "کتنی روٹیاں کھایا کرتے ہو" جس پر سمدھی نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا کبھی چھ کبھی سات "او۔ اتنی؟ دیکھوں میں تمھارا پیٹ" گجر مل اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ سمدھی ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ کہنا چاہتا تھا کہ حضور آپ دودھ، مکھن، توسٹ، کیک درجنوں اور چیزیں بھی تو کھاتے ہیں۔ میں صرف دو وقت روٹی کھاتا ہوں لیکن آواز اس کے حلق میں سوکھ گئی۔ لاہوریا رام نے روپے کا نوٹ فرش پر آٹا خرید نے کیلئے پھینکا۔ سمدھی نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا۔ جیسے وہ آگ کا دہکتا انگارہ ہو اور اس کا ہاتھ جھلس دیگا۔

باورچی خانہ میں پہنچ کر سمدھی نے تہیہ کیا کہ اس دفعہ تنخواہ لیکر ضرور ملازمت چھوڑ دے گا۔ لیکن یہ بابو تو پوری تنخواہ کبھی دیتے ہی نہیں تھے۔ چار پانچ روپے ضرور زبردستی روک لیتے تھے۔ وہ صبح چھ بجے اُٹھ کر کام شروع کرتا تھا۔ اور رات کے گیارہ بجے تک بمشکل فرصت ملتی تھی۔ سرکاری نل سے پانی بھرتے بھرتے کندھے

زخمی ہو جاتے تھے۔ کبھی کپڑے دھونے کا حکم، کبھی استری کرنے کا۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ سارے دن کی مشقت اسے اتنا چکنا چور کر دیتی تھی کہ رات کو نیند بھی اچھی طرح نہ آتی تھی۔ یہی خواب آتے رہتے کہ ایک بہت بڑے آدمی کے قد کا اُلو اس کی کھوپڑی میں نوک دار چونچ سے ٹھونگے مار رہا ہے۔ یا سمرہل اسٹیشن سے ریل گاڑی کا انجن باورچی خانہ میں گھس آیا ہے اور اس کے پاؤں سے سر تک اِدھر اُدھر چکر لگا رہا ہے پانی اتنا سرد تھا کہ ہاتھ لگاتے ہی انگلیاں کٹتی تھیں۔ اور اس کے برتن مانجھنے سے گھسے ہوئے ناخنوں میں سوئیوں کی طرح چبھتا تھا۔ جب کبھی وہ سینما جاتے یا پہاڑی عورتیں لے آتے تو رات کے دو تین بجے تک سونے کی اجازت نہ ملتی۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ یہی دہراتے تھے کہ اس سے اچھی نوکری اور کہاں ملے گی۔

ابھی سمدھی یہ سوچ رہا تھا کہ لاہوریا رام گالیاں بکتا ہوا آیا اور اسے مارتا گھسیٹتا کمرہ میں لے گیا۔ "آج پھر دودھ پی گیا شیطان کے تخم!" وہ کڑھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پھیپھڑوں کے پورے زور سے چلایا۔ کڑھائی خالی تھی ملائی اس کی تہہ سے چمٹ چکی تھی۔ لیکن دودھ غائب تھا۔ وہ سمدھی سے اس قصور کا اعتراف کرانے کے لئے اسے انتہائی بے رحمی سے زد و کوب کرتا رہا۔ گھونسا لات گھونسا لات۔ حتیٰ کہ وہ تھک گیا اور برفانی سردی کے باوجود پسینے سے شرابور ہو گیا۔

سمدھی بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اس کی ہڈی ہڈی کراہ رہی تھی۔ اس کے کپڑے بالکل پھٹ گئے تھے۔ اور اس کے جسم کے ہر عضو سے اتنی شدت سے درد پھوٹ رہا تھا کہ اسے شدید سردی تک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

لاہوریا رام کی اس سنگدلی نے اس کے ساتھیوں کا جذبۂ رحم بیدار کر دیا۔ وہ خود غصہ ٹھنڈا ہونے پر اپنی حرکت پر بہت پشیمان ہوا۔ بھینکی داس نے کہا:

"ایک غریب لاچار بے کس لڑکے پر اتنی بے رحمی!" گجرمل نے اشارہ کیا کہ "دودھ تو بیں پی جایا کرتا تھا۔ بغیر کسی ثبوت کے اس بے زبان لڑکے پر اتنا ظلم نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آخر اسے بتانا پڑا کہ اس نے الماری کی جالی کے چند سوراخ پنسل سے کھول رکھے ہیں۔ جن کے ذریعے کاغذ کی نالی ڈال کر وہ دودھ پی لیا کرتا تھا۔ کچھ دیر جھڑپ ہوئی لیکن یہ معلوم ہونے پر لاہوریا رام اور بھی نادم ہوا۔ بھینکی داس نے اضافہ کیا "یہ غریب لوگ بھی بے زبان حیوان ہیں۔ دیکھو مجھے بے انصافی کا احساس ہے۔ ہر وقت اس کے خلاف چلاتا رہتا ہوں۔ ٹوپی پر لکھ رکھا ہے۔ جب موقع ملتا ہے شکایت کرتا ہوں۔ لیکن ان بیچاروں کو کسی چیز کا احساس نہیں۔ ہم پڑھے لکھے ہیں ہمیں خود انسانوں کا سا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ جب ہم غلطی کرتے ہیں تو اُمید کرتے ہیں کہ ہمیں معاف کر دیا جائے گا لیکن جب اور غلطی کرتے ہیں تو ہم بھول کر بھی معاف نہیں کرتے!"

انھوں نے سمدھی کو دم دلاسا دے کر خاموش کیا۔ اسے گرم دودھ پلایا۔ اس کے نیلاہٹ مائل جسم سے عرق پھوٹ رہا تھا اور اس کی نس نس تھرتھرا رہی تھی۔ لاہوریا رام نے اسے ایک قمیص دی۔ گجرمل نے پیجامہ اور بھینکی داس نے ایڑی اور پنجے سے پھٹی ہوئی جراب۔ سب نے اسے یقین دلایا کہ اب نہ اُسے گالیاں دی جائیں گی اور نہ اسے کبھی پیٹا جائے گا۔ لاہوریا رام نے اسے ٹاٹ کے جوتے کیلئے تین آنے دیئے۔ گجرمل نے مشورہ دیا کہ اس کی تنخواہ میں ۴ر ماہوار کا اضافہ کر دینا چاہیئے۔

سمدھی کے لئے یہ سب کچھ ناقابل یقین تھا۔ وہ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے کسی اندھے کو یکایک بینائی حاصل ہو گئی ہو۔ وہ گندے [illegible] پھٹی ہوئی

[illegible]

آستین سے آنسو پونچھنے لگا۔ تینوں بابو اسے غیر معمولی پیار سے تسلی دے رہے تھے۔ سمدھی شکر گذار نظروں سے ان سب کی طرف دیکھتا ہوا بڑبڑانے لگا۔

"تو اب میں بھی پیالیاں دھلے پانی میں چائے بنا کر دینا بند کر دوں گا!"

جب بیتل پرشاد ایک دیہاتی یکے میں ہچکولے کھاتا اپنے گاؤں کے قریب پہنچا تو اسے ایک بھوکی، تھکی ماندی شام گاؤں کی طرف رینگتی دکھائی دی۔ وہاں کے لاغر، نیم جان، بے حواس کتے بڑے مایوس اور بے دھڑک طریقے سے اس پر بھونک رہے تھے۔

وہ یکے سے اتر پڑا تھا۔ آگے سڑک پر ایک بہت بڑا گڑھا جماہی لے رہا تھا اور یکا آگے نہیں جا سکتا تھا۔ وہ سڑک ہندوستان کی بیشتر سڑکوں کی طرح فٹ دو فٹ گہری ریت اور مٹی کا ناہموار، دشوار گذار راستہ تھی۔ جو برسات میں کیچڑ اور دلدل کی اچھی خاصی بدر رَو بن جاتی تھی۔ ان ریت مٹی اور کیچڑ کی خندقوں نے ہی ہندوستانی دیہات کو دنیا کے مروجہ چیزوں سے علیحدہ کر کے وہاں کی زندگی کو ساکت اور غیر متبدل بنا دیا ہے۔

سیتل نے پھلانگ کر گڑھا پار کیا۔ اور اپنے گرد سے بھورے بال اور کپڑے جھاڑتا ہوا اور بار بار کھنکار کر مٹی سے اٹے ہوئے سینے اور حلق کو صاف کرتا گاؤں کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ روشنی سے ڈرے سہمے درختوں سے لٹکی ہوئی چمگادڑوں نے سرمئی فضا کے دھول بھرے دھندلکے میں تیرنا اور ڈبکیاں لگانا شروع کر دیا تھا۔ مٹی کی بنی ہوئی گز دو گز اونچی مٹیالی جھونپڑیوں میں سے سلگتے ہوئے اُپلوں کا بے جان دھواں بڑی سستی سے آسمان کی طرف کروٹیں لے رہا تھا۔ غیر مانوس، بعید الفہم خیالات ننھی ننھی سرسراہٹوں کی طرح سیتل کے دماغ میں رینگ کر اسے پریشان کر رہے تھے۔

چرواہے بھی سوکھی سہمی بھوکی گایوں کو جنگل سے واپس لا رہے تھے۔ جسے وہ لوگ جنگل کہتے تھے وہ بغیر درخت بغیر جھاڑی بغیر سائے کے بنجر بیابان، خشک چٹیل زمین تھی۔ جس پر برسات میں تھوڑی سی گھاس اُگ آتی اور ایک ماہ ہی میں ختم ہو جاتی۔ اس کے بعد تمام گلہ پیاس اور خشکی سے پھٹی ہوئی زمین کی دراڑوں میں اور مٹی اور مونگے کے ٹیلوں کے نیچے گھاس کی پتیاں یا چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تلاش کرتا پھرتا۔ اس خوراک سے انھیں جتنی قوت میسر ہوتی اس سے زیادہ اس کی تلاش میں خرچ ہو جاتی۔ ان کی مدھم پُر قناعت آنکھوں کی گہری تہوں میں صدیوں کی بھوک چھپی ہوئی تھی۔ ان میں سے بہت سی گائیں صرف ڈھانچے ہی تھیں۔ جن کی بے ڈھب ہڈیاں پتلی سی گوشت چمڑی میں سے بہت بھیانک اور گھناؤنے طریق سے جھانک رہی تھیں۔ اُن میں سے تقریباً تمام کے جسموں میں گھر کئے ہوئے زخم اور ناسور انھیں بیزار کر رہے تھے۔ اور ان پر مکھیوں کے ہجوم بھنبھنا رہے تھے۔ ان گلے والوں نے کبھی بھی اپنے مویشیوں کے لئے کوئی چارہ نہیں بویا تھا۔ ان کے اپنے اناج کیلئے ہی زمین

کافی نہیں تھی ۔ عموماً ان گایوں کی کوئی پروا نہ کی جاتی تھی کیونکہ ان میں سے بہت سی کئی برس ہوئے پاؤ آدھ پاؤ دودھ دے کر سوکھ چکی تھی ۔ یہ ہندوستان کی عام گائیں تھیں ۔

چند بچھڑے گلّے سے ہم قدم نہ رہ سکتے ہوئے اپنی ننھی ننھی کانپتی ہوئی ٹانگوں سے ان کے پیچھے پیچھے لڑکھڑا رہے تھے ۔ ان کی سوکھی پتلی نرم ٹانگیں بڑی مشکل سے آگے کی طرف اٹھ رہی تھیں ۔ رات کو بھی انھیں جھونپڑیوں سے باہر نکال دیا جاتا تھا ۔ تاکہ وہ اپنی ماؤں کا دودھ چوس کر اس پاؤ ڈیڑھ پاؤ دودھ کی دولت کو اور بھی کم نہ کر دیں ۔ بھوک ، جنگل میں گھومنے کی تھکان یا رات کی سردی کی وجہ سے جب وہ اس زندگی کی تکلیفوں سے نجات حاصل کر لیتے تو ان کی چمڑی کو ادھیڑ کر اس میں گھاس پھوس بھر دیا جاتا ۔ ٹانگوں کے نیچے چار چھڑیاں لگا دی جاتیں ۔ اور اسے دودھ دوہتے وقت گائے کے آگے کھڑا کر دیا جاتا تاکہ وہ مامتا سے مجبور ہو کر دودھ دیتی رہے ۔

ان سب سے پیچھے سب سے بوڑھی گائے لرزتی ، ڈگمگاتی ، لڑکھڑاتی آہستہ آہستہ گاؤں کی طرف بڑھے جا رہی تھی ۔ بھورا کیبلا رنگ ، مریل ، دبلی ٹانگیں سکڑی بجھی ہوئی دکھتی آنکھیں ڈھیلے بوڑھے پپوٹے کناروں کے قریب سے پُر اسرار مگر سنجیدہ طور پر اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے ۔ جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہو ۔ اس کی ہڈیاں بڑی سنگدلی سے بے گوشت کی چمڑی کو چیر کر باہر نکل رہی تھیں ۔ ہر ایک ابھری ہوئی ہڈی کے کنارے دوسری ہڈیوں کے سائے میں سے بڑے دردناک طریقے سے جھانک رہے تھے ۔ اس کے جسم پر بھی بہت سے زخم پھوڑے اور چیچڑیاں تھیں اور ایک کوّا اس کی کوٹھے کی ہڈی پر بیٹھا ایک گہرے زخم میں چونچ مار رہا تھا ۔ ایک اور کوّا کائیں کائیں کرتا ہوا ارد گرد منڈلا

رہا تھا۔ چرواہوں کے اسے تیز چلانے کے لئے ہلانے مروڑنے سے اس کی دُم کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ اس لئے وہ اس کی مدد سے کوّے کو اڑانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ سیتل اس بوڑھی گائے کی طرف بڑھا۔ درد سے اس کی بھوری پلکیں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ اور دانت کچکپا رہے تھے۔ اس نے اپنے پپوٹوں کو اوپر اٹھایا۔ اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے سیتل کو دیکھا۔ سیتل نے مٹی کی دو مٹھیاں بھر کر اس کے زخموں پر بکھیر دیں۔ اور جلد جلد گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔

مائی شنکری بھی اس وقت گاؤں میں داخل ہو رہی تھیں۔ دو سال ہوئے جب وہ ہردوار کنبھ کے میلے پر گنگا اشنان کے لئے گئی ہوئی تھی تو اس کا اکلوتا لڑکا پاگل کتے کے کاٹنے سے مر گیا تھا۔ رات کو ارد گرد کے اُجاڑ بیابان سے گیدڑ گاؤں میں آجاتے اور ساری رات ان کی گاؤں کے آوارہ کتوں سے لڑنے کی آوازیں سُنائی دیتی رہتیں۔ کئی مرتبہ پاگل گیدڑ کتوں کو کاٹ جاتے اور ہر سال دو تین درجن آدمی عورتیں بچے ان دیوانے کتوں کا شکار ہو جاتے۔ ان بیمار، نیم فاقہ زدہ کتوں کو مروایا نہ جا سکتا تھا۔ بڑی کوشش کے باوجود سیتل گاؤں والوں کو سمجھانے میں ناکام رہا تھا۔ کیونکہ وہ جیو ہتیا کے پاپ کا ارتکاب کرنا نہیں چاہتے تھے۔

بیٹے کی موت مائی شنکر کے لئے بہت صبر آزما ثابت ہوئی تھی۔ وہ پاگل سی ہو گئی تھی۔ جب کبھی عورتوں کو پنگھٹ کی طرف پانی بھرنے جاتے دیکھتی تو دمے کی کھانسی سے اٹکتی ہوئی آوازیں چلانے لگ جاتی "دیکھو، بیٹیو اپنے بچوں کو گھر اکیلے مت چھوڑ جاؤ" کانپوں۔ سے پوچھتی پھرتی کہ وہ اپنے بچھڑوں کو اکیلے چھوڑ کر کہاں جا رہی ہیں۔ سارا دن اُجاڑ بیابان میں چڑیوں کے پیچھے لڑکھڑاتی پھرتی اور ان سے التجا کرتی کہ وہ اپنے بچوں کو اکیلے چھوڑ کر نہ جائیں۔ اس کے سر کے بال جھڑ

چکے تھے۔ اس کا مُرجھایا ہوا سکڑا ہوا چہرہ جھرّیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کی کالی پرچھائیوں میں چھپی ہوئی غیر متحرک آنکھیں اپنے حلقوں میں ڈگر ڈگر کرتی رہتی تھیں۔ اس کے لبوں کے کونے بڑے اجیرن طریقے سے نیچے کی طرف لٹک رہے تھے۔ سبتل کو دیکھ کر ہمیشہ مائی شنکری کے پھٹے ہوئے سوکھے لبوں میں مسکراہٹ کی ایک ہلکی سی لکیر کھنچ جاتی۔ لیکن اسے یہ مرجھائی ہوئی مسکراہٹ آنسوؤں کو روکنے کی ایک کوشش معلوم ہوتی۔

گاؤں کے شروع میں ہی ٹھاکر دوارہ تھا جس کے سامنے مولسری کے درخت کے نیچے چارپائی پر وہاں کا زمیندار بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کے حواری اور خوشامدی ارد گرد بیٹھے چرس اور گانجے کے دم لگا رہے تھے۔ اور حسب معمول بے معنی اور لغو باتیں کر رہے تھے۔ ٹھاکر دوارے کی پکّی دیواریں ناقوس اور سنکھ کی پُر شور آوازوں سے گونج رہی تھیں۔ شام کی آرتی ہو رہی تھی اور مندر کے پُجاری گلا پھاڑ پھاڑ کر "اوم جے جگدیش ہرے" چلّا رہے تھے۔ مندر کی پچھلی طرف بوڑھا برگد کا درخت کمر جھکائے کھڑا تھا۔ اور اس کے نیچے مندر کے نربل ناکارہ سانڈ زمین پر لیٹے مٹی سے اپنے جسم رگڑ رہے تھے۔ جب کبھی کسی کو سر پر آئی بلا کے لئے اُپائے کرنا ہوتا یا ایشور سے کوئی سفارش کرتا ہوتی تو مندر کو ایک بیل دان کرنے کا وعدہ کرتا۔ اور اپنی مُراد پوری ہونے پر سستے سے سستا بیل لا کر مندر پر چڑھا دیتا۔ اور وہ بیمار کمزور بیل گاؤں کی گایوں کی نسل کو خراب کرتے پھرتے۔ اب سبتل علی گڑھ سے ایک اچھی نسل کے بیل کا انتظام کر کے آ رہا تھا جسے پرسوں گنیش چودس کے تہوار پر وہاں کے ڈیری فارم والوں کو گاؤں کی گایوں کو بیاہنے کیلئے لانا تھا۔

جب سبتل ٹھاکر دوارہ سے آگے بڑھا۔ مندر کے کنوئیں پر چند عورتیں پانی

بھر رہی تھیں۔ اس نے ان عورتوں کے پیلے، جوانی کی صحت سے ناآشنا چہروں کی طرف دیکھا۔ ان کو دیکھ کر ہمیشہ اُس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی اور وہ سوچنے لگ جاتا کہ ان بدنصیب عورتوں کیلئے کبھی جوانی آتی ہی نہیں۔ بچپن اور پھر لڑکپن کے بعد ہی بُڑھاپا آجاتا ہے۔ اور اکثر اس سے پہلے ہی موت آلیتی ہے۔

کوئیں کی چرخی کی کھڑکھڑ۔ ڈول کا دھڑام سے کنوئیں میں گرنے کا دھماکا۔ اور پھر اس کے اوپر کھینچے جانے کی چوں چوں اب اس کے لئے مانوس آوازیں بن چکی تھیں۔ حسبِ معمول پانی بھرنے والی عورت دائیں ٹانگ کو کوئیں میں بڑھا کر اپنے میلے کچڑ آلودہ پیر سے رسّے کو چرخی کے اوپر رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ڈول کے شکستہ پیندے میں کئی سوراخ تھے اور اوپر نکلنے تک اس کا پانی آدھے سے کم رہ جاتا تھا۔ اس وقت پنڈت بانکے بہاری بھی کوئیں کے چبوترے پر چوکڑی مارے بیٹھا اشنان کر رہا تھا۔ غالباً اس پر کسی نیچ جاتی والے کا سایہ پڑ گیا تھا۔ اس نے جنیئو کو کان میں اٹکا رکھا تھا۔ ایک گانٹھ والی لمبی موٹی چوٹی اس کی گردن تک لٹک رہی تھی۔ بھیگ جانے کی وجہ سے اس کی پتلی دھوتی کا عدم وجود برابر تھا۔

آدھی درجن کے قریب چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں جو اپنی ماؤں کے ساتھ کوئیں تک آئے تھے ایک دوسرے کے کُرتوں کا پچھلا حصّہ پکڑے چھک چھک کرتے ہوئے ریل گاڑی کھیل رہے تھے۔ ان کے قریب ہی دو لڑکے گیلی مٹی کی پتلی تہ والی پیالیاں بنا کر انھیں زمین پر زور زور سے الٹا پھینک کر پٹاخے چلا رہے تھے۔ ایک پانچ چھ سال کی لڑکی گائے بھینسوں کے پانی والے حوض میں ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ چند اور لڑکے بکریوں کی سوکھی ہوئی مینگنیاں اکٹھی کر کے ایک دوسرے پر اُڑا رہے تھے۔

سیتل کا گھر گاؤں کے دوسرے کنارے پر تھا۔ تھکان کی وجہ سے اس کی رفتار معمول سے کم تھی۔ راستے میں دھنّے کی جھونپڑی میں جو دھوئیں سے بھری ہوئی تھی اس کی بیوی چولھے میں سلگتے ہوئے ایندھن میں زور زور سے پھونکیں مار رہی تھی۔ اس سے اگلی جھونپڑی میں کسی نے اُڑد کی دال کے چھلکے بغیر دیکھے ہی باہر پھینکے، جو سب اس پر گرے۔ وہ سٹ پٹا کر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ چندو سامنے والی جھونپڑی کے پاس پیشاب کر کے بڑی بے احتیاطی سے اِدھر اُدھر تھوکتا ہوا اسے "رام رام" کہہ کر قریب سے گذر گیا۔ منگل کی بیوی ایک کالی بوتل میں سے جس کی گردن پر کارک کی بجائے بھٹّے کا دانوں سے خالی ڈنٹھل لگا ہوا تھا۔ سرسوں کا تیل نکال کر اپنی بیٹی کے لمبے لمبے بالوں میں چھپی ہوئی کھوپڑی میں رگڑ رہی تھی۔ ان کے اوپر طاق میں ایک دیا جل رہا تھا۔ قریب ہی اس کی بہو اُپلوں کے لئے گوبر سنوار رہی تھی۔

منگت رام کی دُکان جو اس کے گھر کے قریب ہی تھی بند ہو چکی تھی۔ لیکن بہت سے کتّے اس کی دکان کے آگے گرے ہوئے دودھ کے خالی سکوروں اور دہی چٹنی کے پتّے چاٹ رہے تھے۔ اور ایک دوسرے پر بھیانک اور دردناک طریق سے بھونک رہے تھے سیتل کو دیکھ کر انھوں نے بھونکنا اور لڑنا بند کر دیا۔ کئی کتّے اپنی اگلی دائیں ٹانگ اٹھا کر اُدھڑی ہوئی چمڑی کو کھجانے لگے۔ کئی تھوتھنی پر بھنبھناتی مکھیوں پر مُنہ مارنے لگے۔ ایک کتّا دُم ٹانگوں میں دبا کر بیٹھ گیا۔ ان کتّوں کی سُرخ سے بال چمڑی خارش چمڑیوں زخموں اور دیگر تمام بیماریوں سے گل چکی تھی اور ان میں سے سوکھی فاقہ زدہ ہڈیاں اس طرح جھانک رہی تھیں جیسے کوئی مظلوم ظالم کی طرف دیکھ رہا ہو۔ یہ کتّے دوزخ کے گنہگار انسانوں کی ملعون پرچھائیوں کی طرح اپنے وحشت ناک کوڑھی جسم کو لئے اِدھر

اُدھر بیٹھے سارا دن گلیوں میں غلاظت چاٹتے پھرتے۔ اور اپنی غیر حیوانی خشمگیں آنکھوں سے ہر ایک کو گھورتے رہتے اور شام کو بلا ناغہ اس دُکان کے آگے آ اکٹھے ہوتے اور ساری رات لڑائی اور عف عف سے ہلڑ مچائے رکھتے۔

منگت رام کی دوکان کی بائیں طرف بہیڑے کے درخت کے نیچے ایک سیاہ داغوں والی سفید گائے لیٹی ہوئی تھی۔ ڈیڑھ سال ہوا جب منگت رام کی ماں مرنے لگی تو اس نے گئو دان کی خواہش ظاہر کی تاکہ موت کے بعد اسے ایک گائے میسّر ہو جائے جس کی دُم پکڑ کر وہ اِس دُنیا اور اُس دُنیا کا درمیانی سمندر پار کر سکے۔ وہ فوراً ہی شہر جا کر گئوشالہ سے یہ گائے خرید لایا۔ پھوکا کرنے سے وہ کئی برس ہوئے خشک ہو چکی تھی۔ اس کی ٹانگوں کے نچلے حصّے بھی کٹے ہوئے تھے۔ جنھیں غالباً کاٹ کر کسی دوسری گائے کی ٹانگوں سے پیوند کر دیا گیا تھا تاکہ وہ ایک غیر قدرتی عجوبہ بن کر نمائش کیلئے زیادہ متبرک ہو جائے۔ اس وجہ سے منگت رام کو یہ گائے بہت سستے داموں مل گئی تھی۔ برہمن کو رسمی طور پر دان کرنے کے بعد یہ گائے یہاں لا کر لٹا دی گئی اور یہاں وہ درخت سے گرے ہوئے پتّے کھا کر زندہ رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پچھلے دو ہفتوں سے اس گائے کی گردن پر چچڑی چمٹی ہوئی تھی۔ جو اب بہت پھیل چکی تھی۔ اور اس کو گائے کے دل تک پہنچنے میں ابھی چھ سات روز اور باقی تھے۔ جب جیسا کہ منگت رام کہتا تھا وہ قدرتی موت مر جائے گی۔ سیتل اس کیلئے شہر سے مرہم لایا تھا۔ اس کے قریب جا کر چچڑیاں ٹٹول ٹٹول کر وہ ان پر مرہم لگانے لگا۔

جب سیتل گھر پہنچا تو ابھی تک اسے مہمل غیر مانوس ناقابلِ فہم خیالات تعاقب کرتے معلوم ہو رہے تھے۔ پچھلے چند مہینوں کی یادیں دائرہ نما سائے بن کر اس کی

آنکھوں کے آگے پھیلنے سکڑنے لگیں۔

اسے اس گاؤں میں آئے پانچ مہینے ہو چکے تھے۔ جب وہ کالج میں پڑھا کرتا تھا تو سوچا کرتا تھا کہ ہندستان میں سات لاکھ گاؤں ہیں۔ اگر سات لاکھ ہندستانی نوجوان ان کی بہتری اور بہبودی کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیں تو دس ہی سال میں اس بدنصیب ملک کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ وہ ایک ایسا ہی نوجوان بننا چاہتا تھا۔ کالج کی تعلیم کے بعد وہ اس گاؤں جھنجانا میں جو باندہ ریلوے اسٹیشن سے بائیس میل جنوب مغرب کی طرف تھا تین بیگھہ زمین خرید کر رہنے لگا۔

گاؤں کی حالت اس کے اندازہ سے بھی خراب نکلی۔ یہ گاؤں ہندستان کے باقی دیہات ہی کی طرح کیچڑ مٹی اور گوبر کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی بے ڈھب جھونپڑیوں کا ایک جمگھٹا تھا۔ جھونپڑیوں کو بنانے کے لئے مٹی ایک ہی جگہ سے کھودی گئی تھی جہاں ایک بہت بڑا گڑھا ہو گیا تھا۔ جو برسات میں بارش کی وجہ سے اچھا خاصا جوہڑ بن جاتا۔ آہستہ آہستہ سوکھ کر اس کا پانی گاڑھا ہوتا جاتا۔ مویشی اسی میں نہاتے۔ گاؤں کے نیچ جاتیوں کے لوگ اسی سے پینے اور نہانے کیلئے پانی لیتے اور اسی میں سے برتن اور کپڑے صاف کرتے۔ گاؤں کا تمام گندہ پانی اسی میں آشامل ہوتا۔ اس جوہڑ پر ہر موسم میں مچھروں کی چھاؤنیاں لگی رہتی تھیں جو رات کے وقت لوگوں کو ایک پل بھی چین نہ لینے دیتے تھے۔ ہر سال درجنوں جانیں ملیریا کا شکار ہو جاتیں۔ اور موسمی بخار کا ایک آدھ حملہ ہر ایک کو مہینوں کیلئے ناکارہ بنا جاتا۔ سال دو سال بعد چیچک اور ہیضہ بھی رہی سہی کسر پوری کر دیتے۔

جھونپڑیاں بالکل کچی بنی ہوئی تھیں۔ پوال سے ڈھانپی ہوئی مٹی کیچڑ کی بے جان دیواریں۔ بارش ذرا زیادہ ہوتی تو یہ دیواریں بیٹھ جاتیں نہیں تو چھتیں ضرور ٹپکنے لگتیں۔ اور لوگ اپنی ٹوٹی پھوٹی چارپائیوں کو چھت سے ٹپکنے

پانی سے بچنے کیلئے ایک کونے سے دوسرے کونے میں گھسیٹتے پھرتے۔ جاڑے کی راتیں، یہ نیم برہنہ لوگ، اُپلوں کے الاؤ کے ارد گرد سکڑ سکڑ کر گزار دیتے اور جب مئی اور جون میں آندھیاں اور جھکڑ چلتے تو پوال کی ہلکی چھتیں اڑ کر کئی کئی میل دور جا گرتیں۔ اور وہ بغیر کسی پناہ کے رہ جاتے۔ جھونپڑیوں میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔ چولھے کا دھواں اندر ہی چکر کاٹتا رہتا۔ لالٹین تو کیا مٹی کے تیل کے معمولی سے لیمپ بھی ان کی قسمت میں نہیں تھے۔ کڑوے تیل کے دیئے کی لو سے نکلی ہوئی کالی چیونٹیاں ہوا کو ڈس ڈس کر زہر بنایا کرتی تھیں۔ کسی بھی گھر میں پاخانہ نہ تھا۔ بچے گلیوں میں بیٹھ لیتے اور مرد عورتیں باہر کھیتوں میں چلے جاتے۔ اس گندگی اور غلاظت کی وجہ سے کروڑوں مکھیاں، ٹڈے، کیڑے اور دیگر حشرات الارض اتنا کہرام مچائے ہوئے تھے کہ جینا دوبھر تھا۔ ہر طرف گندگی اور بدبو تھی۔ اور لوگوں کے دلوں میں اس سے بھی بڑھ کر متعفن جہالت پڑی سڑ رہی تھی۔

گاؤں میں آتے ہی سیتل وہاں کے سدھار میں تن دہی سے مشغول ہو گیا۔ بچوں کے لئے پاٹھ شالا کھولی۔ اچھوتوں کے لئے پانی کا پمپ لگوایا۔ گلیوں میں موریاں کھدوائیں اور گندے پانی کو جوہڑ کی بجائے کھیتوں کی طرف لے جانے کا انتظام کیا۔ فصل کے اچھے بیج منگوائے۔ گاؤں کے پرانے شکستہ ہل مشکل ہی سے زمین کرید سکتے تھے۔ اس لئے کسانوں کے باری باری استعمال کے لئے ایک درجن بڑھیا ہل بنوائے۔ اور گاؤں کی زندگی کو ہر پہلو سے بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اسے اس کام میں بہت مشکلیں پیش آ رہی تھیں لیکن وہ کسی کی خوشی یا ناراضی کا خیال کئے بغیر اپنی دُھن میں لگا ہوا تھا۔

گاؤں کا سب سے پیچیدہ مسئلہ وہاں کی گائیں تھیں۔ ایک سو ستر کے گلے میں سے ایک سو سے زائد تو سوکھی تھیں۔ باقی صرف پاؤ ڈیڑھ پاؤ دودھ دیتی

تھیں جو گاؤں والوں کی ضرورت کیلئے ناکافی تھا۔ رات کو یہ گائیں فصلیں خراب کرتی پھرتیں۔ اور دن بھر باہر اجاڑ میں گھاس کی پتیوں کی تلاش میں گذار دیتیں۔ ان کے چارے کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ سینتل نے لوگوں کو چارہ بونے کی ترغیب دی اور خود مصری کلوور کی پت پتیا گھاس منگوا کر اپنی زمین میں بوئی۔ وہ شہر سے ایک دس سیر دودھ دینے والی گائے بھی خرید لایا تھا جس سے اپنے اسکول کے بچوں کو دودھ پلایا کرتا تھا۔ اور گاؤں کی گایوں کی نسل کو بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

اگلی صبح منہ اندھیرے سینتل اردگرد کے دیہات میں لوگوں کو کہنے چلا گیا کہ اس سے اگلے دن گائیں بیاہنے کے لئے لے آئیں۔ جب وہ شام کو لوٹا تو سارے دن کے سفر سے تھک کر چور ہو چکا تھا اور اس کے قدم بڑی مشکل سے اٹھ رہے تھے۔

اسی طرح چرواہے گایوں کی دُمیں مروڑتے، ان کی پیٹھ پر چھڑیاں برساتے گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ اور اسی طرح وہ بوڑھی بھوری گائے ان کے پیچھے لڑکھڑاتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ آج معمول سے زیادہ تھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ غالباً آج کی باہمی کش مکش میں اسے کچھ بھی میسر نہ ہو سکا تھا۔ یکایک وہ کھڑی ہو گئی اور گردن اوپر اٹھا کر حسرت بھری آنکھوں سے گرد کے بادل میں چھپے ہوئے ساتھیوں کی طرف دیکھنے لگ گئی۔ اس کی ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔ وہ زمین پر لیٹ گئی اور اردگرد گھومتے کتے اسے گرتا دیکھ کر دوڑے دوڑے اس کے قریب آ گئے۔ وہ یہ دیکھ کر کہ اس کا آخری وقت قریب آ پہنچا ہے زور زور سے بھونکنے لگے۔ ان کے بھونکنے کی آواز سن کر گاؤں کے

اور بہت سے کتّے ادھر آ گئے۔ اور اپنی پُر اشتیاق نتھنوں سے اسے سونگھنے اور اپنی خشک زبانوں سے اسے چاٹنے لگے۔ اُن کے وحشت ناک جبڑوں میں پانی بھر آیا تھا اور ان کی بھوکی پسلیاں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ گائے نے اپنا سر اوپر اٹھا کر ایک دو دفعہ اِدھر اُدھر ہلایا اور پھر بے بس ہو کر زمین پر رکھ دیا۔ اس کا مُنہ کھُلا ہوا تھا جس میں سے زبان باہر لٹک رہی تھی۔

کتّے بھونکتے، چیختے، غرّاتے، ہانپتے، وحشی تیکھے دانتوں کو کچکچاتے اپنی شدید ضرورت سے مجبور اس کی بوٹیاں نوچنے لگے۔

سیتل بھی اتنی دیر میں وہاں پہنچ چکا تھا۔ گائے ہانپ رہی تھی اور اپنی آنکھوں کی بھیگی ہوئی خلا میں سے کتّوں کو گھور رہی تھی۔ سیتل کو دیکھ کر کتّے ڈرتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ سوائے ایک کُتیا کے جس کی تپلی پر چھاؤں میں گھری ہوئی آنکھوں سے کئی ننھی ننھی جانیں بھوک سے کلبلاتی ہوئی جھانک رہی تھیں۔ دوسرے کتّے ڈگمگا رہے تھے لیکن اس نے ممتا سے مجبور ہو کر بڑی بے باکی سے آگے لپک کر گائے کے منہ میں سے نکلتی ہوئی زبان کو نوچ لیا۔

گائے تڑپنے لگی۔ اس کے ڈیلے باہر اُبھر آئے۔ ان میں نفرت اور غصّہ جھلک رہا تھا۔ اس کی لیکھوں سے بھری ہوئی بھوری پلکیں پھڑپھڑانے لگیں۔ اس کے نتھنے پھول گئے اور چند لمحوں ہی میں وہ اپنے جسم کے دُکھوں سے آزاد ہو گئی۔

سیتل کا رواں رواں کانپنے لگا۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ ایک تلخ گھناؤنی اُلجھن سے اس کا دماغ چکرانے لگا۔ اس سے وہاں کھڑا نہ ہوا گیا۔ راستے میں اسے کُتیا کی آنکھوں میں بھوک سے تڑپتی ہوئی ننھی ننھی جانیں چیچڑی زدہ سپید گائے کی موت کا انتظار۔ اس کی کٹی ہوئی ٹانگیں۔ بھوری گائے

کے زخموں میں چونچ مارتے ہوئے کوّے ـــ ان کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بہت سی بھیانک ملول زخمی آوازیں اس کے کانوں کے پردے ڈگدگا رہی تھیں۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر سینتل نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دیا سلائی جلائی لیمپ روشن کیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کے ذہن میں بے شمار مختلف قسم کے خیالات بڑی تیزی سے ایک دوسرے کا تعاقب کر رہے تھے۔ نیم غنودگی کی حالت میں اس کی آنکھوں کی پتلیوں کے آگے گاؤں کی تمام گائیں گھومنے لگیں مریل سوکھی ہوئی گایوں کی اُبھری ہوئی ہڈیوں کے درمیانی گڑھے یکایک اُسے بہت گہرے اور تاریک معلوم ہونے لگے۔ جن میں بے انتہا لوگ ٹھوکریں کھا کر گرتے جا رہے تھے۔ گایوں کی بھوکی ننگی پسلیاں لمبی لمبی تیز چھُریاں بن کر اس کے جسم کو چیرنے لگیں۔

سینتل نے لیمپ کی مدّھم لَو کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی کانپتی ہوئی ٹھوڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور اس کے ہیجانی خیالات اور جذبات کا بڑے غور سے معائنہ کر رہی تھی۔ اپنے ماحول سے نفرت کا احساس اس پر غالب ہوتا جا رہا تھا۔ اپنے آپ پر ملامت کے مکروہ خیالات اس کے جسم پر رینگنے لگے۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی نسوں میں خون کی جگہ زہر بھر دیا گیا ہے اور کھوپڑی میں کڑوا دھُواں، اور وہ ایک کھاری سمندر کو شہد کی ایک دو بوندیں ڈال کر میٹھا کرنے کی طفلانہ کوشش کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ لیمپ کے شعلے کو بڑے انہماک سے دیکھنے لگا۔ وہ اسے کہہ رہا تھا کہ شہری وہ مکھیوں کے چھتے ہوتے ہیں جن میں تہذیب اور تمدّن کا شہد پیدا ہوتا ہے۔ اور جب تک ہندُستان کے

کم از کم آدھے گاؤں اکٹھے کر کے شہر نہیں بنا دیئے جاتے۔ تب تک یہ جہالت دور نہیں ہوگی۔ اور ترقی ایک خواب ہی رہے گی۔ اس کے بہت عرصے بعد تک وہ اپنی اُبھری ہوئی متحیر آنکھوں سے لیمپ کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اس کے دماغ سے عجیب غیر مانوس خیالات اور تصورات کے بخارات اُٹھ رہے تھے۔ کبھی کبھی ذہن پر بے بسی کا سکون چھا جاتا۔ لیکن اسے اس سکون کے حملے خیالات کی بھاری سے بھی زیادہ پریشان کر دیتے۔

اچانک سیتل کو یوں محسوس ہوا کہ یہ مختلف خیالات اس کے بھیجے میں اس طرح رینگ رہے ہیں جیسے گلے سڑے امرود میں سفید سفید کیڑے۔ وہ سٹپٹا کر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور کن پٹیاں رگڑنے اور سر جھٹکنے لگا۔

گاؤں میں داخل ہوتے گیدڑوں کی ہو ہو۔ ہپ ہپ۔ کتوں کی دردناک عف عف، سوروں کی چیخیں، مچھروں کی بھنبھناہٹ، اُلوؤں کی ہوک اور دوسری سینکڑوں قسم کی ناقابلِ فہم اور پُرشور آوازیں اس کے کانوں میں کھلبلی کرنے لگیں۔ یہ سب آوازیں اُسے خدا سے موت کے لئے دُعائیں معلوم ہو رہی تھیں۔ اسے مُردے قبروں سے نکل کر اس دُنیا کو چھوڑ کر کسی اور پُرسکون جگہ کی تلاش کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ کھڑکی کے باہر ہوا درختوں کو زور زور سے جھٹکے دے رہی تھی۔ ان کے پتوں کی سرسراہٹ سے سیتل کو یوں محسوس ہونے لگا کہ پرندوں کے بے شمار جھرمٹ کسی دوسری دُنیا کی طرف اڑے جا رہے ہیں۔ کتوں کی عف عف اسے موت کے لئے ایک بے بس خواہش معلوم ہونے لگی۔ اس کا اپنا دل بھی موت کیلئے للچانے لگا۔ اس کے جسم میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ ایسے خیالات اور تصورات کا فوارہ اس کے دل میں پھوٹ پڑا ہے جنہیں اس کی فطرت سے کوئی نسبت نہیں اور یہ اجنبی

بے رحم خیالات اس پر غالب ہوتے جا رہے ہیں اور اس کے ہاتھوں کو ایک ذریعہ بنانا چاہتے ہیں۔

سیتل نے ایک زہریلا سفوف آٹے میں گھول دیا اور اسے لے کر مکان سے باہر کتوں کی آوازوں کی طرف چلنے لگا۔ اسے ایک بے نام کشش ان کی طرف کھینچتی جا رہی تھی۔ آسمان کی نیلی مٹیالی خاموشی میں ننھے ننھے بادل راستہ بھول کر ادھر اُدھر بھٹک رہے تھے۔ اندھیرے کی گہری دھاریاں اپنی مدھم غمگین آنکھوں سے اس کی طرف مشکوک نگاہوں سے تک رہی تھیں۔ جوہڑ کے گندے متعفن پانی کی تہ میں ننھے معصوم ستارے کانپ رہے تھے۔ وہ منگت رام کی دوکان کے قریب پہنچا۔ تمام کتے سپید گائے کے ارد گرد بھونک رہے تھے۔ ان کے دانتوں میں ایک عجیب چمک تھی۔ اس نے اضطراری طور پر بے بسی کے ساتھ جیسے کسی بیرونی قوت کے دباؤ سے اس زہریلے آٹے کو کتوں کے آگے ڈال دیا۔ وہ لپ لپا اسے چاٹنے لگ گئے۔ سیتل کے آجانے کے بعد بھی کچھ دیر کی ستائی بھوکی گائے نے بھی رینگ رینگ کر اسے چاٹ لیا۔

اگلی صبح جب سیتل بیدار ہوا تو رات کی نیم خوابی کے نقوش ابھی اس کے ذہن سے پوری طرح نہیں مٹے تھے۔ جب وہ نہا کر کپڑے بدل کر مکان سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ کتوں کے علاوہ سپید گائے بھی اس کی رات کی جرأت پریشاں کا شکار ہو چکی ہے۔ گاؤں کے آدمی آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے اور سب اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

مندر کے ارد گرد مختلف چیزیں بیچنے والے اپنا اپنا سامان سجا رہے تھے اور گاؤں کے چھوکرے ادھر اُدھر کھیل یا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے بہت

"ہندوستانی چائے" والوں کے اسٹال کے پیچھے سولہ بگھی کھیلنے کے لئے ٹھیکریوں سے زمین پر لکیریں کھینچ رہے تھے۔ ان کے قریب دو لڑکے سگریٹ کی خالی ڈبی میں سے نکلے ہوئے چاندی کا ورق کیلئے لڑجھگڑ رہے تھے۔ ایک بوڑھا برہمن مندر کے قریب مالا، کنٹھے، جنیؤ، گنگا جلیاں فروخت کر رہا تھا۔ دو سات آٹھ سال کے لڑکے دیاسلائی کے بکسوں میں سے نکلی ہوئی ڈبیوں کو دھاگا باندھ ٹیلیفون بنائے ہیلو ہیلو کر رہے تھے۔ چار آنہ میں فوٹو اتارنے والے فوٹو گرافر کے خوبصورت محل اور باغیچہ والے پردے کا بہت سے لوگ معائنہ کر رہے تھے۔ اردگرد کے دیہات کے لوگ بھی میلہ دیکھنے آنے لگے تھے۔

اتنے عرصے میں علی گڑھ ڈیری فارم کے ملازم بھی سانڈ لیکر آگئے اور لوگ اس کے اردگرد اکٹھے ہونے شروع ہوگئے۔ سیتل اس بیل کو گاؤں کی دوسری طرف جوہڑ کے پار جہاں گائیں اکٹھی کی ہوئی تھیں لے جانے کے لئے مجمع کو ایک طرف کرنے لگا۔ لوگوں نے اتنا موٹا اور تندرست بیل پہلی دفعہ دیکھا تھا وہ بھی اس کے پیچھے ہولئے۔ گاؤں کے لڑکے حسب عادت اسے منع کرنے کے باوجود چھیڑنے لگ گئے۔ ٹھاکر کیرت سنگھ کا لڑکا اس کی دُم پکڑ کر مروڑنے لگا۔ بیل درد کو برداشت نہ کرسکا اور اپنی دُم چھڑانے کیلئے اس نے ٹھاکر کیرت سنگھ کے لڑکے پر سینگوں سے حملہ کیا۔ بیل بھیڑ سے گھبرا گیا تھا۔ دُم چھڑا کر وہ لوگوں کے جمگھٹے میں سے بھاگ نکلا۔ لوگ بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگے۔ زمیندار کے لڑکے کو چوٹ لگی تھی، یہ دیکھ کر اس کے آدمی بیل کو لاٹھیوں اور چھڑیوں سے پیٹنے لگے۔ بیل نے خود حفاظتی کے طور پر چند اور آدمیوں کو چوٹیں لگائیں جس سے لوگوں کا غصہ اور بھی بھڑک اٹھا۔ انھوں نے بیل کو اتنے ظالمانہ طور پر پیٹا کہ اس کی پیٹھ خون سے سُرخ ہوگئی۔ اور وہ زمین پر گر پڑا۔ سیتل سے

لوگ ناراض تھے ہی۔ بیل کو بچانے کی کوشش میں وہ بھی اتنا پیٹا گیا کہ نیم جان ہو کر گر پڑا۔ ڈیری کے ملازم جن کو خود کم و بیش چوٹیں آئی تھیں ان دونوں کو ایک بیل گاڑی میں ڈال کر شہر کی طرف لے گئے۔ مندر کے ایک برہمن نے بیل گاڑی میں بے ہوش پڑے ہوئے سیتل کی طرف آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھا ایشور نے گئو ہتیا کے پاپ کی کتنی جلدی سزا دی"

گاؤں میں گئو ہتیا ہوئی تھی اس لئے پجاریوں نے گنیش چودس کا تہوار منانے سے انکار کر دیا۔ شام کو ٹھاکر دوارے میں اس مہا پاپ کے پرائشچت کیلئے تدبیریں سوچنے کے لئے پنچایت ہوئی۔ ایک تو ایک سو ایک من گھی کا ہون ہونا ضروری تھا۔ کیونکہ مندر کے پجاری دیسی گھی کے پیسے وصول کر کے اور بناسپتی گھی جلا کر کافی نفع حاصل کر لیتے تھے۔ دوسرے گئو دان بھی لازمی تھا۔ ان پجاریوں کی نظر سیتل کی دس سیر دودھ دینے والی گائے پر تھی۔ اس کے علاوہ وشنو سہاسر نام کا منتر، ویدکت منتر اور درگا پاٹھ کا منورمان دیہی اپیادی منتر کا سوا لاکھ دفعہ جاپ بھی ہونا تھا۔ ہردوار سے گنگا جل لا کر گاؤں میں چھڑکوانے کیلئے انھوں نے دو سو روپئے اور گنوا دیئے۔ آخر بہت منت سماجت کے بعد ایک سو روپئے پر فیصلہ ہوا۔ جس میں سے آدھے زمیندار نے دینے کا وعدہ کیا۔ ہون گئو دان اور دوسری رسومات کا چار دن بعد اماوس کے روز مہورت نکلا۔

ٹھاکر کیرت سنگھ نے سیتل کی گائے اپنے پاس منگوا لی اور گاؤں والوں نے بھی دو دن میں پچاس روپئے اکٹھے کر کے دیدیئے۔ تیسرے دن ٹھاکر کیرت سنگھ سیتل کی گائے کو شہر لے گیا۔ اور اسے بوچڑ خانہ میں اٹھاسی روپئے میں بیچ دیا اور پھر گئو شالا کا رخ کیا۔ گئو شالا کے دروازے کے باہر کرشن جی

کی تصویر تھی۔ نیلے رنگ کے کرشن مراری سپید صحت مند لشاش گایوں کو بنسری بجا کر مست کر رہے تھے۔ اور گئو شالا کے اندر رہی بھوکی سوکھی موت کا انتظار کرتی ہوئی گائیں تھیں۔ وہاں سے ٹھاکر جی نے ایک سوکھی مریل گائے جیسی کہ گاؤں میں پہلے ہی بہت سی تھیں تیرہ روپیہ کو خرید لی۔ اس کے بعد بازار سے پانچ روپیہ کے بتاشے لئے اور باقی ستر روپئے سنبھال گاؤں لوٹ آئے۔

اگلی صبح ٹھاکر دوارہ خوب سجا ہوا تھا۔ آم اور نیم کے پتوں کی جھنڈیاں اس کے چاروں طرف لگی ہوئی تھیں۔ دروازہ پر کیلے کے پیڑوں کے ستون کھڑے کئے ہوئے تھے اور دیواریں کھجور کے چوڑے چوڑے پتے میخوں کی مدد سے گاڑے ہوئے تھے۔ اندر گیروے جابجا گنیش کا نشان بنا ہوا تھا۔ سنگ مرمر کے فرش کو پوتر بنانے کیلئے اس پر گائے کے گوبر کا لیپ کیا ہوا تھا۔ کرشن جی کی مورتی پر چندر کلا کا سنہری مکٹ جو خاص خاص موقعوں پر باہر نکالا جاتا تھا لگا تھا۔

ہون کے بعد ٹھاکر کیرت سنگھ نے گائے منگوا بھیجی۔ اس کا سارا جسم گیروے رنگا ہوا تھا۔ اور اس پر لگائے ہوئے چاندی کے سفید ورق بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کے سینگوں پر کناری اور ماؤلی لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے تمام لوگوں کا ہاتھ چھوا کر گائے براہمنوں کو دے دی۔ وہ سینتل کی گائے کی بجائے اس نئی گائے کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ بہت سٹ پٹائے ــــ جھنجلائے۔ لیکن خاموشی کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ ٹھاکر جی نے پچاس روپئے اپنی گرہ سے نکال اور پچاس گاؤں والوں کے ڈال ایک سو روپئے پجاری صاحب کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ بتاشوں کا پرشاد لوگوں میں بانٹا اور پھر باقی

کے بیس روپئے بھی نکال کر اسی پجاری کے ہاتھ میں تھما دیئے اور بڑی فیاضانہ انداز میں کہا:۔

"پنڈت جی یہ لو بیس روپئے ۔ اور پوجا پاٹ خوب اچھی طرح کرانا، کوئی کسر نہ رہ جائے۔"

پتّے باز

گھرکو کے کانپتے ہچکچاتے ہاتھوں نے پردہ اُٹھایا اور لمبی پتلی ٹانگوں نے اس کے دُبلے پتلے ہڈیوں کے پنجر کو خیام ریسٹورنٹ میں داخل کر دیا۔ اس کے نوکدار ڈھیلے گھٹنے اور کُہنیاں تھرتھرا رہی تھیں۔ اور پتلی سوکھی گردن پر مریل کھوپڑی ہچکولے کھا رہی تھی۔ اس کا سارا جسم نَے کی طرح لچک دار بن چکا تھا جب حسبِ معمول وہ کاؤنٹر کے قریب جا کر شراب کی قیمتیں پوچھنے لگا۔ جانی واکر، جان ہیگ، وہائٹ ہارس، بلیک اینڈ وہائٹ، ایکشا نمبر ا ——— شراب بیچنے والے نے جلدی جلدی ان کی قیمتیں بتائیں) اور ہمیشہ کی طرح گھرکو "روز وسکی" کا بڑبڑنگ بڑبڑایا اور ریرابر کی پارٹیشن میں جا گھسا۔

وہ کنپٹیاں ہتھیلیوں میں دبا، کہنیاں میز پر ٹیک، پاؤں فرش پر ہلانے

لگا۔ ناگوار احساسات اس پر حاوی ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے ذہن میں گردے کیلئے خیالات اُبھر رہے تھے۔ انتہائی اذیت آمیز طریقے سے اور موزوں الفاظ نہ ملنے کی وجہ سے ٹھوس اور واضح صورت اختیار کرنے میں ناکام ہو رہے تھے۔ وہ اس سٹے بازی، جوا، شراب اور کوکین کی کلکل کو تیاگ کر شریف بن جانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے کوئی ایسا کرنے نہیں دیتا تھا۔ یہی بے کسی اور لاچاری کا احساس اس کی بوٹیاں نوچ رہا تھا۔ وہ سر اوپر اٹھا، چھت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر آنکھیں پھیلاتا ہوا بڑبڑانے لگا" اے خدا! کیا میں سب کچھ تیرے حکم سے کر رہا ہوں!"

بیرے نے پیگ میز پر رکھ دیا۔ اسے گھرکو غٹا غٹ ایک ہی گھونٹ میں پی گیا۔ آنکھیں زور سے بند کر کے۔ وہ اب کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ یہ بھی بھول جانا چاہتا تھا کہ وہ جی رہا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی بھری ہوئی جیب پر ہاتھ تھپتھپانے لگا۔ اور اسے ابھی ابھی ہاتھ لگے مال کا خیال اس کی نسوں میں بڑے خوش کن طریقے سے دھڑکنے لگا۔ گھرکو کی پیگ پر نظر پڑی۔ شراب کی چند بوندیں بچی رہ گئی تھیں۔ وہ انھیں مُنہ میں ٹپکانے والا ہی تھا کہ اسے خیال آیا، اسے بیروں کیلئے ہی رہنے دے جو ان جھوٹے پیالوں میں سے بچی کھچی بوندیں نچوڑ کر اپنے پینے کا سامان کر لیا کرتے تھے۔

گھرکو پارٹیشن سے باہر نکل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ تین سفید پوش ادھیڑ عمر اشخاص جو آدھی آدھی درجن اولاد کے باپ معلوم ہوتے تھے ریسٹوران میں بجنے والی گھسی ہوئی لڑکی سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ گھرکو کے دل میں بھی یہ خیال گدگدانے لگا کہ وہ وہاں جا کر اس لڑکی سے اس کا مُنہ چوم لینے کی اجازت مانگے

اور پیشتر اس کے کہ وہ ہاں یا نہ کہہ سکے اسے تین دفعہ چوم لے۔ اور قریب ہی کھانا کھانے کی بڑی میز کے نیچے جا چھپے۔ اور پھر اس میں سے سر باہر نکال کر جیسے چوہے بلوں سے مینڈک سر نکالتا ہے۔ اس لڑکی کو بلا کر روز دسکی کی بھری ہوئی بوتل سے اپنے پورے کھلے منہ میں اسے ایک ایک بوند ٹپکانے کیلئے کہے ـــــــ ابھی یہ تصورات اس کے ذہن میں کسی لنگڑے لولے بھکاری کی طرح رینگ ہی رہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے آ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں موند لیں۔ گھر کو سر جھنجوڑتا ہوا بڑبڑایا "کدا، بہا سنگھ، حمید، گاما، گونگا، وولو" لیکن جب ان میں سے کوئی بھی نہ نکلا تو گھر کو کمر جھٹک کر اس کے ہاتھوں سے رہا ہوا۔ جب مڑ کر اس نے پیچھے دیکھا تو پچھّا تھا۔ لے پکڑے اسے جھٹکے دے رہا تھا۔ اور پوچھ رہا تھا "کہاں رہے ہو یار۔ کبھی نظر نہیں آتے؟"

گھر کو گردن لٹکا کر سوچنے لگا۔ پھر سر اٹھا کر پچھے کی طرف دیکھا۔ ابھی وہ اپنے سوال کا جواب طلب کر رہا تھا۔ گھر کو بڑبڑایا "میں عید کا چاند ہو گیا ہوں" لیکن یہ فقرہ اسے کڑوا لگا تو وہ اپنی لچکدار کمر جھکا کر فرش پر تھوکنے لگا۔ پچھے نے کندھے پکڑ کر اسے سیدھا کیا اور اس کی دیوانہ آنکھوں کی پھیلی ہوئی پتلیوں میں دزدیدہ نظر سے دیکھنے لگا۔ جیسے ان کی گہرائی میں کسی چیز کو تلاش کر رہا ہو۔ گھر کو پر گھبراہٹ سی چھا گئی۔ اور اس نے اس گھبراہٹ کو مصنوعی ہنسی میں چھپانے کی کوشش کی۔ ناکام کوشش جس نے اسے اور بھی پریشان کر دیا۔ خدا خدا کر کے گھر کو نے اپنے آپ کو پچھے کی گرفت سے آزاد کیا۔ اور لپک کر باہر نکل گیا۔

باہر نکل کر گھر کو نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس کی سرخ آنکھیں ارد گرد کے مکانات کو اپنی طرف گھورتا دیکھ کر بڑے عجیب طریقے سے اسے دیکھنے لگیں اور وہ خود کو کھو چکا سا محسوس کرنے لگا۔ اس نے پھر کچھ یاد کرنے اور اپنے حواس

مجتمع کرنے کی کوشش میں زبان کو لبوں پر پھیرا۔ ذہن پر زور ڈالا ــــ لیکن اس کے دل کی بے چینی بے قابو ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بازو اوپر اٹھا کر ہوا میں گھمانے لگا۔ جیسے کسی غیر مرئی چیز کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

دائیں طرف دل بہار ٹاکیز کے باہر جھپکتی رنگ برنگی نیون لائٹ نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ کل گھرکو نے وہاں "رنگیلا معشوق" کا تماشا دیکھا تھا۔ اور اس کا دل پھر اسے اس فلم کو دیکھنے کیلئے اکسانے لگا۔ ہیروئن نہانے کیلئے کپڑے اتار رہی تھی۔ جب آخری کپڑا رہ گیا تو آگے سے ریل گاڑی گذرنے لگی۔ اور اسے نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اس کا مدہوش دماغ سوچنے لگا کہ وہ فلم کو پھر دیکھنے کیلئے جائے۔ شاید آج ریل گاڑی نہ آئے اور اس عورت کا ننگا بدن دیکھ سکے۔ یا جب وہ ناچ رہی ہو تو شاید اس کا لہنگا آج ذرا اور اوپر اٹھ جائے۔ یہ خیالات اس کے دماغ میں ایسے دستک دے رہے تھے جیسے کوئی پنچھی بند کھڑکی میں سے باہر نکلنے کے لئے اس کے شیشوں سے سر پیٹ رہا ہو۔ گھرکو نے دھڑ آگے جھکا دیا، گردن لٹکا دی اور اکڑے ہوئے پاؤں اسے دل بہار ٹاکیز کے سامنے لے گئے۔ شو شروع ہو چکا تھا۔ وہ وہاں کے خالی برامدے اور ٹکٹ آفسوں کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

اس کے ذہن کے خلا میں غیر مانوس خیالات منڈلانے لگے۔ غیر ارادی بے چینی اس کا دل کسمسانے لگی۔ اور ایک ایسا جذبہ جس کے لاابالی پن میں ندامت کی چاشنی بھی تھی اس کے بدن میں سوئیاں بن کر چبھنے لگا۔ اس نے سر جھنجھوڑا، آنکھیں جھپکائیں اور تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد وہاں فٹ پاتھ پر ہی بیٹھ گیا۔

وہ چاہتا تھا کہ کوئی اسے گھرکو کے نام سے نہیں بلکہ اس کے پہلے نام

نیکی رام سے پکارے۔ چند سکنڈ کیلئے ہی سہی اس کا شریفوں کی دُنیا میں شامل ہونے کیلئے دل للچانے لگا جس میں وہ پیدا ہوا تھا جس میں اس نے لڑکپن گذارا تھا۔ ماضی کی تصویریں اس کی آنکھوں کے گرد حرکت کرنے لگیں۔ جیسے جیسے پُرانی یادیں بھڑکتی جاتیں گھر کو کا دل مَتلاتا جاتا اور اس پر یہ خواہش غالب آتی جاتی۔ کہ اسے کوئی نیکی رام کہہ کر پکارے۔ پچھلے چند سالوں میں اسکو کئی نام بدلے گئے تھے اور وہ خود حیران تھا کہ ان لوگوں نے اسے گھر کو کیوں کہنا شروع کر دیا ہے۔ بعد ازاں یہ خیال کہ اس زندگی سے بھاگنے کیلئے موت کے سوائے کوئی اور راہ نہیں، اس کے ذہن پر زور زور سے ضربیں لگانے لگا۔ وہ بھاگتی ہوئی ٹریم کے آگے لیٹ جانیکا مصمم ارادہ کرنا چاہتا تھا۔ یا دریائے جمنا میں کُود جانے کا۔ اپنے جسم سے پتھر باندھ کر تاکہ پھر اس کی لاش بھی کسی انسان کی صورت نہ دیکھ سکے۔

ابھی یہ احساسات مکھیوں کی طرح اردگرد بھنبھنا کر اسے دق کر ہی رہے تھے کہ ایک فقیر نے اسے آگھیرا۔ اور لمبی لمبی دُعائیں دیکر بھیک مانگنے لگا۔ پہلے گھر کو نے کوئی توجہ نہ دی۔ لیکن جب یوں راہِ نجات نہ دیکھی تو تنگ آکر اسے طعنہ دیا کہ اگر تیری دُعائیں کوئی سُننے والا ہوتا تو تو کیوں ہاتھ پھیلاتے پھرتا! یہ کہہ کر گھر کو وہاں سے اُٹھ کر بازار کی طرف بڑھنے لگا۔ قطعی بے لبسی اور بے حسی سے۔ جیسے آندھی کے جھونکوں کے زیر اثر۔ سڑک کے دوسری طرف پان سگریٹ والے کی دُکان سے اس نے سگریٹ خریدا۔ اُچک کر اُسے سلگتی ہوئی رسّی سے جلایا۔ اور لمبے لمبے کش لینے لگا۔ آسمان تیزی سے سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ سرد ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اس کے خشک باریک بالوں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے اور ہکی

نیم جان چمڑی کو سنسنا رہی تھیں۔ گھرتو نے کندھے سکیڑ کر قمیص کے بٹن لگا لئے۔ مکانوں پر سیاہی پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ اور وہ اس اندھیارے میں قوی ہیکل دیووں کی طرح اکڑے کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ پولیس کا سپاہی خوانچہ فروشوں کو سڑک پر سے ہٹا رہا تھا۔ بڑے رعب دار انداز میں۔ گھرتو ہلنے لگا۔ سگریٹ کا انگارہ اس کی انگلیوں تک پہنچ چکا تھا۔ اس ٹکڑے کو اس نے سڑک پہ پھینک دیا۔ قریب ہی غلاظت پھینکنے کے بڑے ڈھول میں سے کھانے کیلئے کچھ ڈھونڈھتے ہوئے لڑکے ادھر لپکے اور سگریٹ کے ٹکڑے کے لئے دھکا پیل کرنے لگے۔

سڑک پر چند نوجوان حسین لڑکیاں جا رہی تھیں۔ گھرتو ان کی رنگ برنگی ساڑھیاں دیکھ کر گھرتو کا دل بھر آنے لگا۔ اس خیال سے کہ اس کے حصے میں اتنی بھونڈی چمرخ بیوی کیوں آئی ہے۔ وہ اپنی قسمت کو کوستے ہی لگا تھا کہ اسے یاد آیا کہ وہ بھی سات آٹھ سال ہوئے گذارے کے لائق خوبصورت تھی اور وہ سوچنے لگا کہ جو پرماتما ان نوجوان حسین لڑکیوں کو بوڑھی کھوسٹ عورتیں بنانا گوارا کر سکتا ہے وہ منصف کہاں ہوگا!

یکایک گھرتو محسوس کرنے لگا کہ کوئی عورت بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہی اور سب لوگ بغیر اس کی طرف متوجہ ہوئے گذرے جا رہے ہیں۔ اس کے دل کو ٹھیس لگی۔ کوئی اس کی طرف دیکھتا بھی یا مصرف خیال نہیں کرتا۔ اسے کیوں ننھی سی چیونٹی کی طرح نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ (شاید اس کے پھٹے کپڑوں اور نیستی مارے شریر کی وجہ سے ہو۔) کھدّر بھنڈار کے سامنے ایک امیر آدمی مزدور لڑکے سے جھگڑ رہا تھا۔ وہ اس سے بچّوں کے قیمتی کپڑے اور کھلونے اٹھوا کر لایا تھا۔ مزدور لڑکا چلّا رہا تھا کہ اس سے تین پیسے ٹھہرائے گئے ہیں۔ وہ آدمی

اسے صرف دو پیسے دینے پر بضد تھا۔ گھر گو چند ساعتوں کیلئے انھیں گھورتا رہا۔ اور پھر کھدر بھنڈار میں گھس گیا۔ وہاں سے اس نے عمدہ دھوتی، کوٹ، قمیص اور سفید کھدر کی ٹوپی خریدی۔ اور ان کو پرانے کپڑوں پر ہی پہن لیا۔

باہر نکل کر گھر گو سڑک پر ہی آکھڑا ہوا۔ اور ادھر اُدھر نظریں گھمانے لگا۔ اس کی پلکوں کی بیتاب پھڑپھڑاہٹ چاندنی چوک کی گھما گھمی میں کسی کو ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ جو اس کے دل کے تو قریب تھی لیکن آنکھوں سے دور۔ تریل آرزوئیں اس کے دل میں کروٹیں لیکر بیدار ہو رہی تھیں۔ اس نے چھاتی اُبھار کر بڑے غیر واضح انداز میں آسمان کی سیاہ وسعت میں دیکھا۔ اور بازو اوپر اٹھا کر قریب کے درخت سے پتہ توڑ لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ ایک نازک ڈالی سی حسین لڑکی اس کی راہ تک رہی ہے۔ اور اسے دیکھتے ہی اس کی محبت میں گرفتار ہو جائے گی۔ اتنے میں ایک ٹریم اسے اپنی طرف آتی دکھائی دی اور اس کے آگے لیٹ جانے کا خیال پھر اس پر سوار ہو گیا۔ جب ٹریم قریب سے گذرنے لگی تو گھر گو نے اس کے آگے کودنے کی کوشش کی لیکن اس پر کپکپی طاری ہو گئی بالآخر وہ لپک کر اس میں سوار ہو گیا۔

ٹکٹ دینے والے نے جب ٹکٹ لینے کیلئے کہا تو گھر گو خاموش اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ٹکٹ خریدنے سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ضروری تھا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے متعلق یا کسی سنجیدہ بات پر غور کرنا اسے وبال معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اکنی نکال کر ٹکٹ دینے والے کے ہاتھ میں دی اور ٹکٹ لے لیا۔ دفعتہً یہ خیال اسے بیزار اور مضطرب کرنے لگا کہ وہ ٹریم سے اُتر ہی کیوں نہ جائے۔ اور کسی لمبی سیدھی سڑک پر چلنا شروع کر دے۔ سڑک جس کا دوسرا کنارہ کسی نے نہ دیکھا ہو۔ پھر یہ شبہ اس کے دل میں ابھرنے لگا کہ دنیا میں

کوئی سیدھی لمبی سڑک ہے ہی نہیں۔ سب ٹیڑھی شکستہ، سانپ کی طرح بل کھاتی سڑکیں ہیں۔ دریا کے پوتر پانی تک کو سیدھے چلنے کے لئے راہ نہیں ملتی۔

یہ خیالات انتہائی بے رحمی سے اسے درہم برہم کرنے لگے۔ آخر ٹرم سے اتر جانے کی خواہش ناقابلِ ضبط ہو گئی۔ اس نے گھنٹی بجائی اور ٹرم رکنے کا انتظار کئے بغیر نیچے کود گیا۔ گنگو پر ایک خواب کی سی حالت طاری ہو رہی تھی۔

اس وقت وہ کوچہ سیتا رام کے قریب تھا۔ جس میں مائی بھیروں کا مندر تھا۔ جہاں قسم قسم کے جوؤں کا اڈا تھا۔ وہاں وہ عموماً جوا کھیلنے جایا کرتا تھا۔ گنگو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک بے نام قوت جو اس سے بہت زیادہ طاقت ور ہے بغیر اس کی خواہشات کا پاس کئے، بغیر اسے سوچنے کا موقع دیئے اسے ادھر اُدھر کھینچ رہی ہے، ایک ایسی قوت جس کے آگے وہ مطلقاً بے بس ہے۔ پھر یہ تصور کہ سب لوگ چھوٹے بڑے رسّوں سے بندھے ہوتے ہیں اس کی آنکھوں کے آگے پھیل گیا۔ اور اسے تمام انسان اپنے اپنے رسّوں کے مقابلہ میں بالکل بے بس اور لاچار معلوم ہونے لگے۔

وہ عادتاً مائی بھیروں کے مندر کی طرف بڑھنے لگا۔ مندر کے کونے میں ایک کنواں تھا جس کے دائیں طرف پیاؤ کی بغل میں مندر کی پچھلی کوٹھڑیوں میں جانے کا راستہ تھا۔ پیاؤ کے قریب والی کوٹھڑی میں سوراخ تھا۔ گھڑے کا جوا کھیلنے والے پانی پینے کے بہانے پیاؤ پر آ کھڑے ہوتے۔ اور سوراخ میں اپنی اپنی رقم پھینک دیتے۔ نام اور نمبر بول دیتے، اندر بیٹھا ہوا آدمی اُسے کاغذ کی پرچی پر لکھ کر ایک مٹکے میں پھینک دیتا۔ ہر سنیچر وار کو اس گھڑے میں سے ایک پرزہ نکالا جاتا۔ جس کا نمبر نکلتا اس کو پچاس گنا رقم ملتی۔ اور باقی لوگوں

کاروبیہ ضبط ہوجاتا۔ ہر ہفتے سیکڑوں مزدور، کاریگر، ادنیٰ دُکان دار اپنی سات دنوں کی خون پسینے کی کمائی وہاں بھینٹ کردیتے، اس خیال سے کہ اگر پرماتما نے ان کا نمبر نکال دیا تو وہ بھی محسوس کرسکیں گے کہ وہ انسان ہیں۔ کوٹھڑی کے اندر پیشہ ور قمار باز مختلف قسم کا جوا کھیلا کرتے تھے۔

اس پیاؤ پر بھگت جی پانی پینے والوں کا انتظار کرتا رہتا۔ سردی کا موسم ہو یا گرمی کا، کوئی پانی پینے آئے یا نہ آئے۔ وہ کانپتے لرزتے ہاتھوں میں گڑوا پکڑے وہاں بیٹھا رہتا۔ اور رات کو وہیں لیٹ جاتا۔ وہ درمیانی عمر کا جھکے قد کا آدمی تھا۔ اس کے سر پر بے ترتیب، خشک، جوؤں بھرے بالوں کے گچھے، اون کی میلی سیاہ ٹوپی کی طرح تھے۔ گرد بھری سفید بھورے کالے بالوں کی بے وضع ڈاڑھی اس کے تمام چہرے پر تسلط جمائے ہوئے تھی۔ اور آنکھوں کے نچلے پپوٹوں سے گردن تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس میں سے ایک بڑی ساری بے ڈھب ناک بڑے گھناؤنے پن سے ابھری ہوئی تھی۔ ہمیشہ لوگ اسے ستاتے چھیڑتے رہتے۔ اور وہ ان پر تھوکتا۔ گندی بے سری گالیاں دیتا رہتا۔ اس وقت اس کے پھولے ہوئے نتھنوں کے نیچے ایک تاریک گڑھا نمودار ہوجاتا۔ تین لمبے زرد دانت مشتعل کرنے والے کو گھورنے لگتے۔ اور موٹی غلیظ زبان موسلی کی طرح اس اندھیرے گڑھے میں حرکت شروع کردیتی۔ حتیٰ کہ اس کا سانس پھول جاتا۔ وہ تھک کر چت لیٹ جاتا اور "پانی پانی" کی چیخیں اس کے حلق میں غرغرانے لگتیں۔ پھر بغیر کسی کا انتظار کئے وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے لوٹے سے پانی پی لیتا۔ سٹہ لگانے والے گڑھے سے نکلنے والا نمبر معلوم کرنے کیلئے اس کے تھوکنے اور گالیوں کو گنتے رہتے۔ کوئی کچھ حساب لگاتا کوئی کچھ۔ جس کا نمبر نکلتا وہ بھگت جی کو حلوا پوری کھلاتا۔ دوسرے اپنا تخمینہ غلط سمجھتے۔

اس کے وجدان میں کسی کو شک نہ گزرتا۔

جھٹ پٹا ہونے کے باوجود وہاں اچھا خاصا مجمع تھا۔ اور بھگت جی کی گالیوں اور ٹھوکوں کی گنتی سے پرچی پرپرچی چل رہی تھی۔ گھرکو ان کے چہروں پر آنکھیں دوڑاتا کوٹھڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ دروازہ پر دھنّا انیمی اونگھ رہا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر گھرکو کی طرف دیکھا اور مبہم سی مسکراہٹ میں لب پھیلا دیئے۔ اس کے ہونٹ ایک جیسے نہیں تھے۔ نچلا بالائی سے بہت موٹا تھا اور جب وہ مسکراتا تو نچلے لب کی کپکپاہٹ اسے ڈراؤنی رنگت دیدیتی۔ جب وہ کسی نئے واقف یا مشکوک شخص کو کوٹھڑی کے اندر جاتا دیکھتا تو رونے اور چیخنے لگتا۔ اس اشارہ پر جوا کھیلنے والے قمارباز سب سامان سمیٹ لیتے۔ دیئے گل کر دیئے جاتے اور ہُکا کنوئیں کی تہ میں جا پہنچتا۔ گھرکو کو اچھی طرح پہچان کر دھنّے انیمی نے دروازہ کھول دیا۔ اور وہ اس سوراخ میں سے کمر جھکا کر اندر داخل ہو گیا۔

گھرکو نے نظریں ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک گھمائیں، جواریوں کے گروہ مختلف قسم کا جوا کھیلنے میں ہمہ تن مشغول تھے۔ ٹین کے دیوں کی اندھیری روشنی میں سب کے چہرے بھیانک دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے انسانوں کے خون کے پیاسے بھوت آپس میں مالِ غنیمت تقسیم کر رہے ہوں۔ اس کا جیل کا ساتھی مولا بخش اور دوست نہا سنگھ جو یو۔ پی، بہار کی طرف سے عورتیں اغوا کر کے پنجاب میں فروخت کیا کرتا تھا وہیں طرف کوڑیوں سے سوٹھی کھیل رہے تھے۔ پر وہ مت کوڑیاں پھینک رہا تھا اور کوئی چت چلّا رہا تھا، کوئی پٹ۔ گھرکو ان کے قریب جا کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی ذہنی قوتوں کا انتشار ناقابلِ برداشت ہو چکا تھا۔ وہ کمرے کی بھاری ہوا، شراب کی بدبو، دیوں کی کالک، ہمّا کو، سلفے اور گانجے کے دھوئیں کو بے حد شوق سے نگلنے لگا۔ اس کے

گال ایسے کانپ رہے تھے جیسے انہیں بھڑنے کاٹا ہو۔

نہا سنگھ نے گھرکو کو قریب بیٹھا دیکھ کر اسے اپنے چھوٹے کھردرے ہاتھوں سے اپنی طرف کھینچا اور جوا کھیلنے کی دعوت دی۔ پہلے گھرکو خاموش اور غیر متوجہ رہا لیکن جب اسے یوں ٹلتا نہ دیکھا تو وہ گردن کے پٹھے اکڑا کر اس کی طرف گھورتا ہوا بڑبڑانے لگا "مت کھیلو جوا، کیوں کسی غریب کی خون پسینے کی کمائی ضائع کر رہے ہو۔"

نہا سنگھ بے ترتیب ڈاڑھی میں سے اپنے رخسار باہر ابھارتا ہوا چلایا۔

"کمائی تو سب غریبوں ہی کی ہے لیکن ان کے پاس رہنے کون دیتا ہے!"

مولا بخش نے جیب سے نوٹ نکال کر مٹھی میں بند کر لئے اور انہیں فرش پہ رکھ کر دعا مانگی "اے خدا تیرے پاک پٹ نکلے" پر وہ بہت لے دونوں ہاتھوں کی ایک بڑی مٹھی بنا کر کوڑیاں چھن چھنائیں اور فرش پہ پھینک دیں۔ سولہ میں سے بارہ کے چھید اوپر کی طرف تھے۔ مولا بخش مسرور ہو کر موٹے چھدرے بالوں کی ناگ پھنی سی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا "اگر خدا نہ ہوتا تو دنیا کا کیا ہوتا؟"

"اگر خدا ہے تو دنیا کا کیا حال ہے؟ مولا بخش . . . کبھی سوچا ہے؟" ایک ہارے جواری نے حجت کی۔

سب اس سے بے دھیان ہو کر جوئے میں مشغول تھے۔ اور وہی چت پٹ کا شور مچا رہے تھے۔ وہ سب کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورنے اور دانت کچکچانے لگا۔ اس کا دل ڈانواں ڈول ہو رہا تھا۔ وہ کھسیاتا ہو دبک کر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا کہ سامنے والے کنوئیں میں کود جائے اور للکار کر کہے کہ "ارے بے بس تنکو! اگر زندگی کے خلاف احتجاج کی ضرورت ہے تو میری تقلید کرو۔"

گھرکو کو دیا سلائی جلنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ملبے ڈھیر

بائیں بغل میں بالوں کے گچھے کو آگ دکھا رہا تھا۔ اس نے قمیص اتار کر دائیں کندھے پر رکھ چھوڑی تھی۔ میلی پان کی پیکوں بھری دھوتی اس کے کولھوں سے لٹک رہی تھی۔ اور سر پر ننھی سی چوٹی بینگن کی ڈنڈی کی طرح ابھری ہوئی تھی۔ چوڑے گدے ہوتے ماس، بھرے ہوئے شانے، موٹے ابھرے ہوئے ہونٹ پلکوں سے خالی بھروٹے، قدرتی سلوٹوں سے بھرا ماتھا، مغرور ضدی شرم سے خالی آنکھیں، یہ سب اس کی شکل وہیئت میں انتہائی موزوں دکھائی دے رہے تھے۔ جب اس کی بغل کے بال جل چکے تو ہتھیلی سے مسل کر انہیں بجھاتے ہوئے اس نے کہا: "اگر پرماتما یہ گھاس نہ اگاتا تو اس کا کیا بگڑتا؟"

"اگر تمہیں پیدا ہی نہ کرتا تو کیا بگڑتا؟" گھر کو آگے سرکتا ہوا چلایا۔

اتنے میں کدّا اس کو کوٹھڑی میں داخل ہوتا دکھائی دیا۔ گھر کو گردن اٹھا کر وہاں کے سرمئی دھندلکے میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اندھیارے میں اس کا چہرہ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن حافظے نے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ڈھیلے، پتلے، سوکھے، کاہل آدمی کی تصویر لا کھڑی کی۔ چھوٹی پچکی ہوئی ناک جس کے نتھنے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ انچ ڈیڑھ انچ منہ اور پتلے پتلے لبوں کی لکیریں، کھردرے ہموار رخسار، میلے پھٹے ردّی کپڑوں سے جھانکتا بے ڈھب جسم۔ نزدیک آنے پر گھر کو نے دیکھا کہ اور ہی رنگ جما تھا۔ اس نے بڑے قیمتی اور صاف کپڑے پہن رکھے تھے۔ جامع مسجد میں نماز جمعہ کے وقت لاؤڈ اسپیکر لگائے جانے پر دو پارٹیوں میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ ایک فریق اس کی ضرورت پر زور دے رہا تھا اور دوسرا اسے ناجائز قرار دے رہا تھا۔ دونوں کے ہر روز جلسے ہو رہے تھے۔ گھر کو کو یاد آیا کہ اس وجہ سے کدّو اور اس کے جیب کترے ساتھیوں کے خوب ہاتھ رنگے جا رہے تھے۔

سُندر ایک خوبصورت چھوکرا تھا۔ غریب۔ وہ ہر شام عورتوں کا گاؤن پہنکر وہاں آجایا کرتا تھا۔ کدّے نے اس کے بال نوچے، ران اور بازو پر چٹکیاں لیں گدگدیاں کیں۔ اور اس کے آگے پیسہ پھینک کر وہ پروہت کے پاس جابیٹھا۔ پیسہ لیکر وہ لونڈا کودتا ہوا ایڑیوں کو چوتڑوں پر پٹخارنے لگا۔

کدّے نے گھر گو کا بازو کھینچا۔ اور کھدّر کے کپڑے اور ٹوپی دیکھکر بولا۔ ”یہ بگلا بھگت کب سے؟“

گھر گو بیزار ہو رہا تھا۔ اس کے ذہن میں بے ترتیب خیالات ہلڑ مچا رہے تھے۔ اور وہ اس افراتفری سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ لپک کر تقریر کرنے لگا ”ہمارے کھدّر پہننے سے ہی ہندوستان کے ننگے بھوکے لوگوں کے تن ڈھکے جاسکتے ہیں۔ کھدّر سے ہی ہمارے ملک کو آزادی حاصل ہوگی۔

کھدّر میں ہے وہ شان وہ سادگی کا رنگ شرمندہ جس کے سامنے ہے اطلس فرنگ“

کدّے نے جماہی لی اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ گھر گو کے مرچیں لگیں۔ لیکن اس نے غصّہ پی جانا ہی مناسب سمجھا۔ وہ بے بس ہو کر انگلیوں کو چٹخانے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ لوگ اپنے وطن کے بُرے بھلے سے بے پرواکیوں ہیں۔ یہ حُب الوطنی یا فلاحِ انسانی ان کیلئے شاید بہت دور کی چیزیں ہیں۔ قطعی ناقابلِ فہم۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ ہندوستانیوں کو اس آزادی کی ضرورت نہیں جس کیلئے سرپھرے وطن پرست قربانیاں کر رہے ہیں بلکہ انہیں گناہ کی آزادی چاہیئے۔ چوری، شراب خواری اور بدمعاشی کی۔ اور انھیں اس سے صرف اس وعدے پر روکا جاسکتا ہے کہ سُورگ میں یہ آزادیاں حاصل ہونگی۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ یہ خیالات اسے کیوں ستارہے ہیں۔ ان کو اس سے زیادہ عقل مند آدمیوں کے دماغ میں خلل انداز ہونا چاہیئے۔

کدّے نے بٹوے سے نوٹ نکال کر مٹھی میں بند کر لئے اور اسے فرش پر رکھ کر چت چت بڑبڑانے لگا۔ مولا بخش نے بھی گھر کو کو ساتھ کھینچ کر بٹھا لیا۔ اور بازی لگانے کا حکم دیا۔ اس نے تمام رقم مٹھی میں لی اور پٹ پر بازی لگا دی۔ پروہت نے کوڑیاں پھینک دیں۔ نو کوڑیوں کے چھید اوپر کی طرف تھے۔ ہار دیکھ کر گھر کو نے لپک کر بھاگنے کی کوشش کی۔ پروہت اور کدّا اس کے پیچھے دوڑے۔ نوٹ چھین کر اسے انھوں نے زور سے دھکّا دیا۔

گھر کو جلدی جلدی باہر نکلا۔ اتنا تیز کہ راستہ میں اس کا پاؤں دھنّے اپنی کی کھوپڑی سے ٹکرایا۔ لیکن وہ رویا یا چلّایا نہیں۔ یہ تو بہت معنی خیز تھا ـــــ وہ بلیماران کی طرف لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ ایک مبہم خوف اس کا تعاقب کر رہا تھا وہ پر لگا کر کہیں اڑ جانا چاہتا تھا۔ اس زندگی سے بہت دور جہاں بدی کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی نظر نہ آئے۔ جہاں شریف بے گناہ ہوتے ہیں کوئی مزاحمت نہ ہو۔

بلیماران پہنچ کر گھر کو نے دھوتی میں چھپائے ہوئے نوٹ نکالے۔ جوئے خانہ سے بھاگتے وقت ان کو بائیں مٹھی میں لیکر اس نے وہاں اُڑس لیا تھا۔ پینتیس روپئے گن کر اس نے انھیں جیب میں ٹھونس لیا۔

گھر کو کے اُلجھے ہوئے ذہن میں ایک غیر واضح خیال زخمی ادھ موئے سانپ کی طرح تڑپ کر اضطراب پیدا کر رہا تھا۔ یہ ایک اندھی نربل چمگادڑ کا خیال تھا جو دن کے اجالے سے خائف تھی جس نے رات کے اندھیرے میں درختوں اور دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر پر توڑ لئے تھے۔ اور اب دھول اور گرد میں انتہائی بے بسی سے موت کی طرف رینگ رہی تھی۔ یکایک چاروں طرف اسے ایسی چمگادڑیں

دکھائی دینے لگیں۔ مکانوں کی درزوں میں چھپی ہوئی، تاریکی میں ڈبکیاں اور کریہہ قہقہے لگاتی، کیچڑ اور مٹی میں رینگتی ہوئی چمگادڑیں۔ اس کے احساس کی سراسیمگی ناقابلِ برداشت تنفّر میں تبدیل ہو گئی۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کے خون کی ایک ایک بوند، اس کے جسم کا ہر جزو اس سے پوچھ رہا ہے "کیا اس نجاست میں ڈُل ڈُل کر مرنے کے لئے یہ بے فائدہ بے معنی زندگی گذار رہے ہو"

گھرکو نے ہاتھوں کو بلند کیا اور منہ ہی مُنہ میں چلّانے لگا "اے خدا تو نے مجھے پیدا ہی کیوں کیا۔ اس انسان کی بھلا کیا ضرورت تھی" اسے محسوس ہو رہا تھا کہ تمام قدرت اپنے خالق سے اس تخلیق کا مدّعا پوچھ رہی ہے۔ لاکھوں سوال سے اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اور دُنیا کا ذرّہ ذرّہ خدا کو پکار کر کیوں کیوں چلّا رہا ہے۔ اسے ایک بہت بڑا سوالیہ نشان ہوا میں لٹکتا دکھائی دیا۔ از حد مضحکہ خیز انداز میں ہنستا ہوا۔ یہ سب اسے برہم اور پریشان کر رہا تھا۔ اسے ہر چیز سیاہ نظر آ رہی تھی جیسے راکھ میں اٹی ہو۔

میونسپل کمیٹی کے تنگ پیشاب خانہ میں بہت سے مزدور سکڑے بیٹھے تھے۔ اس کے آگے ایک سات آٹھ سال کا لڑکا سوڈا اور لڑکی بوتلیں دھو رہا تھا قریب ہی دو عورتیں ہوٹل کے چولھے سے پھینکی ہوئی راکھ کے لئے تُو تُو میں میں کر رہی تھیں۔ اور اس سے جلے ہوئے کوئلوں کی کنکریاں چُن رہی تھیں۔ گھرکو کا جی اور بھی متلانے لگا۔ یہ لاکھوں کروڑوں دُکھ اور بیماریوں کے جراثیم۔ اس غربت کا کیا مطلب ــــ ہم کیوں پاؤں رکھنے کے لئے ذرا سی جگہ مل جانے پر راضی ہو جاتے ہیں اور بغیر حیل و حجت جیئے جاتے ہیں۔ ہم کیوں روٹی کا سوکھا ٹکڑا ملنے پر ہی چین کی بنسی بجانے لگتے ہیں۔

دفعتاً رحم کا شدید جذبہ اسے بے قابو کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسے شخص کی بے رنگ تصویر گھومنے لگی جو بغیر کسی سے کچھ پوچھے بغیر کچھ مانگے اوروں کی خدمت کئے جا رہا ہے۔ تندہی اور عقیدت سے۔ پھر اس کے دل میں شبہ ابھرنے لگا کہ یہ حیوان، یہ کتے اور بیل بھی تو انسان کی دل و جان سے خدمت کرتے ہیں۔ لیکن گھر کو نے اسے اُبھرنے نہ دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اگر ارتقا کے دوران میں دُم کے ساتھ انسان کا دماغ بھی مفقود ہو جاتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ تب یہ وہم اور شک کا منبع ہی مٹ جاتا۔

وہ کسی کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ بے لوث محبت کا جذبہ اسے شدت سے محسوس ہونے لگا۔ اس کے پٹھے نرم ہوتے جا رہے تھے۔ وہ سب طرف ہمدردانہ اور شفقت انگیز نظروں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ یہ خواہش اسے ستا رہی تھی کہ تانگہ ہی الٹ جائے یا کوئی سائیکل سوار موٹر کے نیچے آجائے تاکہ اسے ہمدردی اور نیک دلی کے اظہار کا موقع ملے۔ لیکن کوئی تانگہ یا سائیکل نہ الٹی اور نہ کوئی راہرو ہی کیلے کے چھلکے سے پھسلا۔ اسے دھکا لگا۔ کیا کسی کو میری ہمدردی کی ضرورت نہیں — یہ سوچ اسے بیزار کر رہی تھی۔

وہ ایک ہوٹل کے آگے سے گزر رہا تھا۔ وہاں کھڑے ہوئے ایک فقیر نے پکار کر کہا "بابو بھوک سے مر رہا ہوں ایک دو روٹیاں دلوا دو۔" گھر کو اسے سنجیدہ ہمدردی سے دیکھنے لگا۔ اور اسے روٹیاں لیکر دیتے ہوئے کہنے لگا "پگلے بھوک سے کوئی نہیں مرتا، نہیں تو ہندوستان کی آبادی اڑتیس کروڑ تو کیا اڑتیس لاکھ بھی نہ ہوتی۔"

جب گھرکو چاندنی چوک میں پہنچا تو دو جگہ بھیڑ جمع ہو رہی تھی۔ پہلے جمگھٹے میں اس نے پہنچ کر دیکھا کہ ایک نوجوان سائیکل سے گرا پڑا ہے۔ اس کے ماتھے کے گھاؤ سے خون پھوٹ رہا تھا۔ لیکن لوگ پیشتر اس کے کہ ڈاکٹری امداد پہنچائیں یہ دریافت کر رہے تھے کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ گھرکو نے جلدی سے تانگہ منگوا کر زخمی آدمی کو اس میں سوار کیا۔ اور ایک لڑکے کو جو اس میں دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا پانچ روپئے دیکر اسے ڈاکٹر کے پاس لیجانے کیلئے کہا۔

دوسری جگہ ایک عورت اپنی ننگی ٹانگوں کو دھوتی کے چیتھڑوں میں لپیٹے سہمی دبک کر بیٹھی ہوئی تھی۔ سائیکل سے اُلجھ کر اس کی دھوتی تار تار ہو چکی تھی۔ اور ارد گرد کھڑے لوگ اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ عورت انتہائی بے چینی کا شکار بنی ہوئی تھی۔ اور لبوں کو کاٹ کر مشکل سے چیخیں روک رہی تھی۔ وہ ڈری سہمی چیخیں جو اس کا گلا گھونٹ رہی تھیں۔ گھرکو اس کی اس حالت پر شرم محسوس کرنے لگا۔ وہ اپنی روح تلاش کرنے لگا لیکن اسے ایک بھی موزوں لفظ نہ ملا جس سے وہ اپنی ہمدردی کا اظہار کر سکے۔ چشم زدن میں وہ ایک دھوتی خرید لایا جسے اس عورت نے لپیٹ لیا۔ اسے تانگہ میں بٹھا کر گھرکو نے زبردستی ایک روپیہ اس کے ہاتھ میں ٹھونس دیا "لے لو کرایہ ہے تانگہ کا۔"

گھرکو کی ٹانگیں اسے گھنٹہ گھر کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ راستہ میں ایک سپاہی رکشا قلی کو پیٹ رہا تھا۔ اس نے بائیں کی بجائے دائیں کو نکلنے کی کوشش کی تھی۔ گھرکو اس لڑکے کو پولیس مین سے چھڑا کر رکشا میں بیٹھ گیا۔

تیزی سے بھاگتی موٹروں کے درمیان رینگتی رکشا گھرکو کے جذبات بے رحمی سے سہلانے لگی۔ سامنے گھنٹہ گھر سر اونچا کئے کھڑا تھا۔ بالآخر اس نے اس سے کود جانے کا پورا تہیہ کر لیا۔ کیونکہ ندامت اس پر غالب آ چکی تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے رکشا

ٹھیروائی۔ وہ تیزی سے لپک کر گھنٹہ گھر کے پاس پہنچا۔ لیکن اتنے میں اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ وہ بے ترتیبی سے ہانپ رہا تھا۔ اس کی نسیں پھڑپھڑا رہی تھیں اس پر اضطراری کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ اور اس کے جسم سے عرق پھوٹ رہا تھا۔ گردن جھکائے وہ رکشا میں واپس آ بیٹھا اور اسے کوئینز گارڈن چلنے کو کہا۔ ٹاؤن ہال کی اندھیری محراب کے نیچے پہنچ کر وہ رکشا سے اتر پڑا۔ اور اس نے جیب سے تمام رقم نکال کر اس لڑکے کے ہاتھ میں رکھدی۔

رکشا قلی گھر کو کی طرف انتہائی تحیر سے دیکھنے لگا۔ وہ اس کی حرکات کا مطلب نہیں سمجھ سکتا تھا۔

"انھیں لے لو۔ کسی غریب کے ہی ہیں" گھر کو کے لبوں سے پھوٹ پڑا۔ وہ دوزانو ہو کر اس لڑکے کے آگے جھک گیا۔ رکشا والے نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن گھر کو مصمم اور التجا بھرے لہجہ میں کہا "بھیا مت روکو۔ میں تمھارے آگے نہیں غربت کے آگے سر جھکا رہا ہوں"

باپ دادا کا نام

کاش انسان کے پر ہوتے جن کے ذریعے وہ اپنی اُمیدوں اور ولولوں کی
مُنتہا تک اُڑ کر پہنچ سکتا۔ اسے اس بلندی کا چپہ چپہ رینگنا پڑتا ہے۔ ہمارے دلوں
میں تمنائیں پر تولتی ہیں۔ اُمنگیں کروٹیں لے لیکر بیدار ہوتی ہیں لیکن عموماً یہ
اتنی کمزور اور ناپائدار ہوتی ہیں کہ کوئی واضح صورت اختیار کرنے سے پہلے دم
توڑ دیتی ہیں۔ اگر کوئی باہمت قوت سمیٹ کر اوپر کی طرف قدم بڑھانے پر کمر
بستہ تو ہو جاتا ہے مگر جلد ہی اسے نیچے پٹخ دیا جاتا ہے۔ پہلے سے بھی بہت نیچے۔
ہم سفرِ حیات کی کسی بھی منزل پر کیوں نہ ہوں ہمارے دلوں میں یہ لنگڑی لولی
امیدیں ہمیشہ رینگتی رہتی ہیں۔ بے بس، بے آس بھکاری کی طرح ————
ہماری زندگی کی رات میں ایک ننھا سا دیپک ہر وقت ٹمٹماتا رہتا ہے۔ مایوسی کے

گہرے اندھیرے میں سر ٹپکتا رہتا ہے۔ جب اُمید کی ایک قندیل گُل ہو جاتی ہے تو اس کی جگہ خود بخود اور روشن ہو جاتی ہے ـــــ اور اس طرح ہم جئے جاتے ہیں۔

آسارام کے دل میں بھی بے چین اُمیدوں نے پر تولے تھے۔ اس کے من میں بھی ولولے رہ رہ کر پھڑپھڑاتے تھے۔ آخر پر ٹوٹ جانے پر دبک کر بیٹھ گئے۔ اس نے بھی اوپر اُڑنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا لیکن لڑکھڑا کر نیچے گر پڑا تھا۔ بہت نیچے۔

اس کے باپ نے اس سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کر رکھی تھیں لیکن ان کے بر آنے سے پہلے ہی وہ فوت ہو گیا۔ ان دنوں آسارام بی۔ ایس سی کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ڈیڑھ گھر سودوں کی برادری میں وہ پہلا لڑکا تھا جو کالج میں داخل ہوا تھا۔ آسارام کے باپ کو یقین تھا کہ اس کی آنکھوں کا تارا نام پیدا کرے گا۔ بڑا رتبہ پائے گا۔ لیکن ان امیدوں کو کامیاب ہوتے دیکھنا اس کی قسمت میں نہ تھا۔ والد کی رحلت پر آسارام کو کاروبار سنبھالنا ضروری ہو گیا۔ ان کا اچھا خوش حال گھرانا تھا۔ رہائش کے مکان کے علاوہ اور بہت سا مال و دولت اسے ورثہ میں حاصل ہوا۔ تمام جائداد کا وہ اکیلا وارث تھا۔ اس کے علاوہ اس کا اپنا بیاہ انہیں دنوں ہوا تھا۔ جس میں اسے بیش قیمت جہیز ملا تھا۔ ان کا بنارسی ریشم کا کاروبار تھا۔ کام سنبھالتے ہی آسارام دل و جان سے محنت کرنے لگا۔ وہ خود بہت بلند ہمت اور عالی حوصلہ انسان تھا۔ اس کا سینہ بھی امیدوں سے بھرپور تھا۔ چند مہینوں میں کاروبار اور بھی چمک اٹھا۔ اور اس کی آمدنی پہلے سے بھی زیادہ ہونے لگی۔

آسارام کے باپ کا اُسے پارچہ بافی کی تعلیم دے کر مصنوعی ریشم کا کارخانہ کھولنے کا ارادہ تھا۔ آسارام نے بھی اس خواہش کو میراث میں پایا تھا۔ وہ والدِ مرحوم کی اس آرزو کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا اپنا فرزندانہ فرض سمجھتا تھا اور اس کیلئے وہ اور بھی تیزی سے دولت فراہم کرنے لگا تھا۔

انہی ایام میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ ہر طرف فوج کیلئے سامانِ جنگ و اشیائے خوردنی بہم پہنچانے کیلئے ٹھیکوں کی لوٹ مچ رہی تھی۔ خراب سے خراب چیز دوگنی چوگنی قیمت پر خریدی جا رہی تھی۔ آسارام صرف کھانے، سنگار کی میزیں، الماریاں اور کرسیوں وغیرہ کا ٹھیکہ حاصل کر سکا۔ یہ فرنیچر فوجی افسروں کے آرام کے لئے میدانِ جنگ میں بھیجا جاتا تھا۔ اس نے تمام جائداد گروی رکھ کر یہ سامان تیار کروایا۔ لیکن اتنے میں اُن افسروں کا جنھیں اس نے رشوت دے رکھی تھی تبادلہ ہو چکا تھا۔ تمام سامان نامنظور ہو گیا۔ بجائے اس کے کہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ کا نفع حاصل ہوتا آسارام کو قرضہ ادا کرنے کیلئے تمام جائداد فروخت کرنی پڑی۔ وہ بالکل کنگال ہو چکا تھا۔ اس کا کاروبار تباہ ہو چکا تھا۔۔۔۔۔۔

چاروناچار اسے ایک پارچہ فروش کی دکان پر تیس روپے ماہوار پر ملازمت کرنا پڑی۔

آسارام اب وہ پرانا آسارام نہ تھا۔ وہ اب ایک نئی دُنیا کا باشندہ تھا۔ خوشی بادلوں کے سایہ کی طرح بغیر کوئی نشان چھوڑے یکایک غائب ہو گئی تھی۔ اس دنیا سے تعلق یا رشتے کا احساس اس کے دل سے مٹ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بوڑھا محسوس کرنے لگا۔ اس کی شکل و صورت کچھ اور ہی ہو گئی تھی۔ اس کی آواز کرخت بن گئی تھی۔ اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا تھا اور اس پر عجیب و غریب خیالات کی پرچھائیاں

رینگتی رہتی تھیں۔ اس کی آنکھیں چندھیا کر چھوٹی چھوٹی درزوں کی مانند ہو گئی تھیں اور ان میں ہمیشہ سیاہ ٹکٹکی بھی رہتی۔

اب وہ کمر جھکا کر چلتا۔ اور اس کا لٹکا ہوا سر سوکھی گردن پر ہچکولے کھاتا معلوم ہوتا۔ جب کبھی اسے کوئی پرانا دوست ملتا تو وہ سڑک کی دوسری طرف ہو جاتا۔ سر کو اور بھی جھکا کر چھاتی پر لٹکا لیتا۔ اور اسے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہہ رہا ہے۔ دیکھو قسمت نے اسے کیسا الو بنایا ہے۔ جب کبھی وہ کسی سے باتیں کرتا تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ اس کے الفاظ گھٹیا صابن کے جھاگ کی مانند ہیں۔ اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔

ایکا ایکی آسارام پر یہ افشا ہوا کہ اس کا لڑکا بلا کا ذہین ہے اور غیر معمولی قابلیت اور ذہانت کے آثار دکھا رہا ہے۔ اس کی عمر ابھی چار سال ہی کی تھی لیکن وہ قبل از وقت نشوونما پا رہا تھا۔ آسارام نے اسے گنتی اور ابجد پڑھائی تھی جو اس نے فوراً ازبر کر لی تھی۔ وہ دوسرے لڑکوں کے مقابلہ میں صفائی پسند اور سیدھا سادا بچہ تھا۔ اس کے ہم عمر لڑکے ادنیٰ قسم کے کھیل کھلونوں میں مصروف رہتے اس کے برعکس وہ ان سے الگ تھلگ بزرگوں کے پاس بیٹھا انتہائی انہماک سے ان کی باتیں سنا کرتا۔ درحقیقت اسے ساتھیوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کی ہر حرکت میں آسارام کو ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کی صداقت نظر آتی تھی۔ آسارام اب پہلے کی طرح دوستوں اور رشتہ داروں سے آنکھ نہیں چراتا تھا۔ جب کبھی اس سے کوئی ملنے آتا تو لڑکے کی ذہانت کا ذکر شروع ہو جاتا۔ اور اسے وہ تمام سبق طوطے کی طرح رٹنے پڑتے۔ زمین آسمان، چاند ستاروں کے متعلق عجیب عجیب سوالات اس سے وابستہ کئے جاتے۔ بنسری کی تان سنا دے کرشنا،

کا گیت جو کئی مہینوں کی کوشش کے باوجود اسے ٹھیک طرح یاد نہیں ہوا تھا غلط سلط ہی پڑھوایا جاتا۔ اور آسارام ساتھ ساتھ حاشیہ آرائی کردیتا کہ وہ جان بوجھ کر ایسا کررہا ہے۔ دوسرے لڑکے برسوں مدرسوں میں پڑھتے رہتے ہیں تب بھی کچھ نہیں سیکھتے اور یہ بغیر کچھ بتائے سب کچھ سیکھ جاتا ہے۔ آسارام نے بہت سوچ بچار اور صلاح مشورے کے بعد اس کا نام روشن لال رکھا اور اُسے یقین تھا کہ وہ غیر معمولی بچہ ہے اور خاندان کو کسی اونچے رُتبے تک پہنچانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔

روشن لال کو مدرسے میں داخل کرادیا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ جماعتوں کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اور وہی غیر معمولی ہونے کا سایہ اس کے ساتھ چمٹا رہا۔ اسے ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ کھیلنے نہیں دیا جاتا تھا۔ یہ اس کی شان کے شایاں نہیں تھا۔ آسارام خود میلے پھٹے کپڑے پہنے رہتا لیکن روشن لال کے لئے اچھے صاف ستھرے کپڑوں کی کمی نہیں تھی۔ آپ سوکھی کھاتا۔ روشن لال کو دودھ ملائی ملتی۔ تاکہ اس کا دماغ اچھی طرح نمو پاسکے۔ امتحانات میں جب اس کا لائق تعریف نتیجہ نہ نکلتا تھا آسارام ادھر ادھر کے بہانے تلاش کیا کرتا۔ ماسٹر یا ہیڈ ماسٹر مسلمان ہے روشن لال امتحانات کے دنوں میں بیمار تھا۔ یا اس نے جان بوجھ کر پرچے اچھے نہیں کئے تھے تاکہ لڑکے حسد نہ کریں۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد روشن لال کالج میں داخل ہوا۔ اس کی تعلیم کے اخراجات بہت بڑھ گئے۔ اس وجہ سے آسارام کو اور بھی شدت سے محنت کرنی پڑی۔ اسے پیٹ اور زیادہ کاٹنا پڑا۔ وہ بیٹے کو پارچہ بافی کی تعلیم کے لئے جاپان بھیجنا چاہتا تھا۔ مصنوعی ریشم کے کارخانہ کا خیال ابھی تک اس کے ذہن میں ٹھٹھا

رہا تھا۔ بہت کوشش کے باوجود بھی وہ روپیہ جمع کرنے میں ناکام رہتا۔ اس نے متعدد لاٹریوں کے ٹکٹ بھی خریدے۔ ہر طرف ہاتھ پاؤں مارے لیکن قسمت نے یاوری نہ کی۔

بی۔ ایس سی پاس کرنے کے بعد روشن لال جاپان نہ جا سکا۔ اور نہ ہی آکر کوئی اچھی ملازمت مل سکی۔ آسارام کی امیدیں مدھم پڑنے لگیں۔ پھر اس کا دل مُردہ ہوتا جا رہا تھا۔ ناکام آرزوئیں اس کے ذہن میں ٹوٹے ہوئے برتن کی طرح کھنکھناتی رہیں۔ وہ پھر دوستوں سے پہلو تہی کرنے لگا۔ اب وہ ہر ایک سے لڑنے کو تیار ہو جاتا۔ امید کی شمع جو چند سالوں کے لئے سنبھل گئی تھی اب پھر جھلملانے لگی۔

بالآخر آسارام نے ایک راہ نکال لی۔ کرپا دیوی اس کی بال ودھوا خالہ تھی۔ چھوٹی عمر میں اس کی ایک بوڑھے ساہوکار سے شادی ہو گئی تھی اور پیشتر اس کے کہ وہ شادی کا مطلب سمجھ سکے وہ بیوہ ہو چکی تھی۔ اس کے کوئی بچہ نہیں تھا جسے وہ کھلاتی، جس کی پرورش کرتی اور جس کی شادی کی خوشیاں مناتی۔ کچھ عرصے سے اس کے دل میں یہ خیال سمایا ہوا تھا کہ تلسی کے پودے اور شوجی کی مورتی کا بیاہ رچا کر اپنی حسرت پوری کر لے۔ اس نے یہ خیال آسارام کو کئی دفعہ بتایا تھا۔ ایک دن اسے یہ بات خوب پسند آئی اور اس کے بعد وہ خود خالہ کو اس کی ترغیب دینے لگا کہ اب تمھاری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ عمر کا آخری وقت ہے جتنی جلدی پُن دھرم کا کام کر لو اچھا ہے۔ اسے رضامند ہوتے دیر نہ لگی۔ برہمن بلا کر مہورت نکالا گیا۔ شادی کی تاریخ ٹھہرائی گئی۔ جو بڑی دھوم دھام سے قرار پائی۔ تمام رشتے داروں کو نیوتا بھیجا گیا برہمنوں کیلئے سدابرت لگا۔ کل دس ہزار روپئے خرچ ہوئے۔ جس میں سے پانچ ہزار

سے زائد آسارام نے خود اُڑس لئے تھے۔

جب روشن لال پارچہ بافی سیکھ کر واپس آیا تو اِدھر اُدھر نوکری تلاش کرنے لگا۔ آسارام کے خواب کہ ہندوستان لوٹتے ہی اس کے لڑکے کے جلوس نکلیں گے۔ اخبارات میں اس کا چرچا ہوگا۔ پورا نہ ہوا۔ وہ ایک پارچہ بافی کے کارخانہ میں اس کے مالکوں کو یہ یقین دلا کر ملازم ہوگیا کہ وہ بنولوں کے ضائع شدہ ریشوں سے جو سوتی کپڑا بنانے کے کام نہیں آسکتے مصنوعی ریشم تیار کرسکے گا۔ مشینیں منگوائی گئیں۔ اور چند مہینوں میں کارخانہ چلنے لگا۔ اور مل مالکان کو خوب منافع ہونے لگا۔ مگر روشن لال کی آمدنی وہی دوصد روپئے ہی رہی۔ اس خیال سے آسا رام بہت جلتا کہ اس کا لڑکا اپنا محل بنانے کی بجائے اوروں کے محلات میں اینٹوں کا کام دے رہا ہے۔ والد کے اصرار پر روشن لال تنخواہ میں اضافہ کیلئے تقاضا کرنے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ کہ اور کاریگروں کے کام میں مہارت حاصل کرنے پر اسے ملازمت سے جواب مل گیا۔

روشن لال نے والد کو جب یہ خبر سنائی تو وہ بے ہوش ہوگیا۔ بہت کوشش کے بعد اسے ہوش آیا۔ ہوش آنے پر خوب جی بھر کر رویا۔ کمرہ میں اندھیارا سا ہو رہا تھا۔ بجلی کا قمقمہ بہت مدھم ہوگیا۔ اور اس کی طرف ایسے بچے کی اُداس غمگین آنکھوں کی طرح دیکھ رہا تھا جس سے کھلونے چھین لئے گئے ہوں۔ اس کا دل شیشے کی طرح چُور چُور ہو رہا تھا۔ روشن لال کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئی تھیں۔ وہ عزعزاتی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔

"سو جاؤ بیٹا سو جاؤ۔ ہر ایک کو دُکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔ یقیناً میرے حصّے میں زیادہ آئے ہیں۔"

اس نے روشن لال کا ہاتھ اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا " بیٹا اب بیاہ ضرور کر لو۔ شاید تمہارا بیٹا ہی باپ دادا کا نام روشن کر دے "

بیج اور پھل

بھارت پراویڈنٹ بیمہ کمپنی میں مجھے بطور امیدوار کلرکی کرتے ہوئے پانچواں مہینہ تھا۔ تنخواہ ادا کرنا تو درکنار وہ میری ضمانت کے اڑھائی صد روپیہ لوٹانے تک کا نام نہیں لیتے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ ڈانٹ ڈپٹ اور طعنہ تنبیہہ میں جھنکاڑ کے کانٹوں کی طرح روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ جو سبز باغ مجھے مینیجر نے دکھائے تھے ان میں اتنے کڑوے پھل لگیں گے۔ جب میں امیدواری ختم کرنے سے پیشتر ضمانت واپس لینے کیلئے لڑ جھگڑ کر اسے گالیاں بڑبڑاتا غصے میں آگ بگولا ہوا دفتر کی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا تو راستے میں رکھے ہوئے بستوں اور جزدانوں سے ٹھوکر کھا کر لڑکھڑاتا ہوا دھڑام سے نیچے جا پڑا۔ سیڑھیوں کا بازار کا حصہ مینیجر نے ایک چاٹ بیچنے والے کو کرایہ پر دے رکھا تھا۔ اور اسکول سے لوٹتے ہوئے لڑکے اپنی کتابوں اور جزدانوں کو سیڑھیوں

میں پھینک کر اس کے خوانچے سے بھکر بھکر کھا رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ اُٹھ کر سڑک کی دوسری طرف لاکھ بنانے والے کی دوکان پر جا بیٹھا۔ اور اپنی کہنیوں اور گھٹنوں کو دبانے اور مسلنے لگا۔ درد کی شدت سے میرا جسم سنسنا رہا تھا اور ان شریر لڑکوں کے قہقہے ابھی تک کم نہیں ہوئے تھے۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ آسمان ابر آلود تھا جیسے کہ شروع بھادوں میں ہوا کرتا ہے۔ دھوپ کی دھیمی روشنی نے رخصت ہوتے دن کو خاکستری رنگت عطا کر رکھی تھی۔ پُرنم ہوا تھکے ہوئے گھوڑے کی طرح غیر مسلسل سرعت سے سانس لے رہی تھی۔ کبھی کبھی آفتاب پھٹتے ہوئے بادلوں میں بکھرے ہوئے جھروکوں کی نیلی گہرائیوں میں سے دزدیدہ نظر سے جھانک لیتا تھا۔ غصہ سے میرا رواں رواں تلملا رہا تھا۔ کبھی ضمانت کے اڑھائی صد روپے کا خیال میری کنپٹیوں پر زور زور سے ضربیں لگانے لگتا، کبھی پانچ مہینے کی بغیر تنخواہ محنت کا احساس تن بدن کو پھونک دیتا۔ میں نے بایاں ہاتھ ماتھے پر رگڑتے ہوئے گردن نیچے لٹکا دی اور میری نظر میلی خستہ حال پتلون پر پہنتے ہوئے امیرانہ بوٹ پر پڑی۔ پچھلے مہینے ایک دوست کانپور جا رہا تھا۔ یہاں چپل دو تین روپئے کو خریدی جاسکتی تھی۔ اس خیال سے کہ شاید وہاں ڈیڑھ روپئے کو مل جائے۔ میں نے اس سے ایک جوڑا خرید لانے کی استدعا کر دی تھی لیکن وہ کریپ کے تلے والا سانبر کا بوٹ خرید لایا تھا۔ اور اس کی قیمت ساڑھے بارہ روپئے چار دنا چار مجھے ادا کرنی پڑی۔ اپنے آپ سی بھونڈے مذاق پر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے ایک دل خراش ہنسی لبوں پر پھیلا دی۔

میں نے رُخ بدل کر سامنے کی پان والی دوکان پر آویزاں قدِ آدم آئینے میں اپنے چہرے کے پریشان عکس کو دیکھا۔ اٹھنے کی کوشش کی اور پھر وہیں بیٹھ

گیا ـــــــ اس دکان کے قریب ایک غریب لڑکے نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ وہ بڑی للچائی ہوئی نظروں سے چاٹ کھاتے ہوئے لڑکوں کو جو اس کے ہم جماعت معلوم ہوتے تھے دیکھ رہا تھا۔ وہ شکل و لباس سے انتہائی مفلس گھر کا چراغ معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنے کوٹ کی وسعت سے بہت بڑھ چکا تھا اور اس کے بازو تنگ، پھٹی ہوئی، بے بٹن آستینوں سے کہنیوں تک باہر نکل رہے تھے۔ دائیں جیب بالکل چاک اور کالر کھلا ہوا تھا۔ اور اس کے کئی مہینوں سے نہ کٹے ہوئے بالوں میں پھنس رہا تھا۔ اس کے جوتے بہت بڑے سائز کے تھے جنہیں اس کے پاؤں پر ٹھیک بٹھانے کے لئے ان کے پنجوں میں کاغذ اور کپڑے کے ٹکڑے بھرے ہوئے تھے۔ جو بہت سے شگافوں سے باہر جھانک رہے تھے۔ اس کی قمیص کا واحد بٹن غلط کاج میں لگا ہوا تھا۔ اس کا مدقوق چہرہ معصوم تنفر کی آئینہ داری کر رہا تھا۔ چہرہ جو بالکل مرجھا رہا تھا سوکھے ہوئے گلدستے کی مانند تھا۔ اس کی آنکھوں میں غصّہ اور نفرت کی سُرخ دھاریاں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود ان میں جو کسی کی چمک تھی۔ کبھی کبھی وہ کھانسنے لگتا تھا اور کمر جھکا کر اپنے ننھے نیلے کاسنی رنگ کے ہاتھوں سے سینہ دبا لیتا تھا۔

میونسپل کمیٹی کے جاروب کش نے اس سڑک پر جھاڑو دینا ابھی ابھی ختم کیا تھا۔ اور ہوا میں آویزاں گرد کے ذرّات بادلوں سے آنکھ مچولی کھیلتے، آفتاب کی آتی جاتی شعاعوں میں سونے چاندی کے ذرّات کی طرح چمک اور جگمگا رہے تھے۔ اچانک میری نظر ایک چھ سات سال کی لڑکی پر پڑی جو شراب میں مدہوش باپ کی انگلی پکڑے اسے گھر لے جا رہی تھی۔ اس آدمی کا منہ سوجا ہوا تھا جیسے وہ جلندر کا مریض ہو۔ اس کے اُکھڑے ہوئے کنٹھ میں تعویذ پھنس رہا تھا۔ سڑک پر چلتا چلتا وہ راہگیروں سے باتیں کرتا جاتا تھا۔ میرے قریب سے گذرتے وقت

وہ میری طرف گھور گھور کر تاکنے لگا۔ اس نے اپنی ناک سکیڑ لی جس سے وہ اور بھی تیکھا دکھائی دینے لگا۔ اور طنز آمیز لہجے میں دانت کچکچاتا ہوا کچھ بڑبڑایا میں بھی رحم بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا ______ بدنصیب انسان جس کے پاس خوشی حاصل کرنے کیلئے شراب پینے اور بچے پیدا کرنے کے سوائے اور کوئی چارہ کار نہیں۔

ہوا اچانک ساکن ہو گئی تھی۔ خاصی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ اور زمین خشک مٹیالے گھس سے ہانپ رہی تھی۔ ڈوبتا سورج بھی بالکل ساکن معلوم ہونے لگا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ایک کارخانہ کے دود کش سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ہے۔ اور اُفق کی گہرائی میں چھلانگ لگانے سے اسے بزدلانہ خوف روک رہا ہے۔

مہتر نالی صاف کرتے ہوئے تمام غلاظت اس کے کنارے پر پھیلاتا جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک سقہ مشک سے پانی کی پتلی لکیر اس کنارے پر ڈالتا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ پانی کی لمبی دھار ایک لمبی سلاخ ہے جو مٹی اور غلاظت کو کرید کرید کر اور بھی سڑاہند پھیلا رہی ہے۔ درجن بھر سے زائد گدھے سڑک پر سے گزرے۔ ان پر لدے ہوئے بورے کوڑا کرکٹ سے لبالب بھرے ہوئے تھے اور ان میں سے گرد اور گندگی کی لمبی قطار سڑک پر ٹپک رہی تھی جیسے ادھ ننگے بچے ٹھوکریں مار کر بازار میں پھیلاتے جا رہے تھے ______ لاکھ والے کی دکان کے سامنے لاکھ سینکنے کے پیڑے کے ضائع شدہ چیتھڑے بکھرے پڑے تھے۔ انھیں گوشت کے ٹکڑے سمجھ کر چیلیں بار بار لپک کر ہوا میں ڈبکیاں لگا رہی تھیں کبھی کبھار کوئی کتا جلدی جلدی ان کی طرف بڑھ آتا اور سونگھ کر خراماں خراماں مایوس لوٹ جاتا۔ میں یہ سب کچھ انتہائی انہماک سے دیکھ رہا تھا جیسے کسی ٹیلے

راگ سے بے خود ہو رہا ہوں۔

فضا میں دھندلے اندھیارے کی پھوار چلکتی جا رہی تھی۔ یہ اندھیارا بیمار چہرے کی طرح بے کیف اور افسردہ تھا۔ مجھے ہر شے پر بیگانگی کا عالم دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے پنجر تک میں میری اپنی روح نہیں ہے۔ بلکہ کسی اور کی گھس آئی ہے۔

چھڑکاؤ کی بیل گاڑی چھڑکاؤ کرتی ہوئی بازار میں سے گزر رہی تھی۔ اس کی چرچراہٹ سن کر چاٹ کھاتے لڑکے جلدی جلدی پتے چاٹ کر کپڑے بھیگنے کی پرواکئے بغیر پانی پھینکنے والی نلی میں لٹکتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ میرے قریب کھڑا ہوا لڑکا بھی جوتے پھٹپھٹاتا ان کے ساتھ چلنے لگا۔ اور میں بھی اٹھ کر ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ گاڑی بان نے ان لڑکوں کو پیچھے سے ہٹ جانے کیلئے بہت سی آوازیں دیں۔ لیکن بے سود۔ آخر لاچار ہو کر وہ بیلوں کو پیٹنے والی چھڑی لے کر گاڑی پر سے اتر آیا۔ تمام لڑکے بھاگ گئے اور اس غریب بے قصور لڑکے کے ایک چھڑی پڑ گئی۔ وہ روتا ہوا اس آدمی کو دانتوں سے کاٹنے کیلئے لپکا۔ میں نے انھیں علیحدہ کیا ــــــــ لڑکے پرے کھڑے ہنس ہنس کر آوازے کس رہے تھے۔ وہ غریب لڑکا ان کی طرف بڑی تلخ، بے بس نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے سے ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ ان کو مار کر بھاگ جانا چاہتا ہے۔ لیکن بڑے ناگوار طور پر خائف ہے کہ مبادا وہ سب مل کر اسے اور بھی زیادہ زدوکوب نہ کر ڈالیں۔

ایکا ایکی کھانسی کا شدید دورہ اس پر غالب آ گیا۔ اور اس کا سر اتنے زور سے تھرتھرانے اور ہچکولے کھانے لگا کہ اس کی پھٹی ہوئی تیل اور میل کے داغوں سے سیاہ ٹوپی نیچے گر پڑی۔ اور اس کے ہم جماعت لڑکے پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ ناقابلِ ضبط

غصہ سے اس لڑکے کے لب پھڑپھڑانے لگے۔ اس کا کانپتا ہوا مکے میں بھنچا ہوا ہاتھ اضطراراً اوپر اٹھ گیا۔ لیکن اس نے اسے بےبس کم ہمتی سے فوراً ہی نیچے گرا دیا۔ اتنے میں دوسرے لڑکے بھی اس کی طرف دوڑ آئے تھے۔ انھوں نے اس کے بازو پکڑ لیے اور آگے کی طرف گھسیٹتے ہوئے اس کے کانوں میں خرافات بکنے لگے۔ جب اس غریب لڑکے کا بس نہ چلا، ہاتھ پاؤں مارنے پر بھی جب وہ اپنے آپ کو ان کے چنگل سے رہا نہ کر سکا تو اس نے لپک کر دانتوں کو ایک لڑکے کی کلائی میں پیوست کر دیا۔ اور اس کے رونے تڑپنے پر بھی نہ چھوڑا۔ یہ دیکھ کر ایک اور لڑکے نے ربڑ کی گیند کی مانند تنے ہوئے گال اکڑاتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر انگلیوں کو اس غریب لڑکے کے بکھرے ہوئے بالوں میں دفن کر دیا۔ اور پورا زور لگا کر انھیں نوچنے لگا۔ اس کے ایک اور ساتھی نے اپنی بغیر چوکھٹے کی سلیٹ نکال کر اس غریب لڑکے کے بازو پر زور سے ضرب لگائی۔ کوٹ پھاڑ کر سلیٹ بازو میں گھس گئی تھی۔ بہت گہرا زخم ہو گیا تھا جس سے خون کی دھار بہنے لگی۔ بیشتر اس کے کہ میں انھیں علیحدہ کر سکوں چشم زدن میں یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔

وہ غریب لڑکا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ بڑے رقت انگیز طریقے سے مبہم ملول چیخیں اس کے گھٹے ہوئے حلق میں بے حد درد مند انداز میں بھنبھنا رہی تھیں جیسے کہ وہ جھاگ بھرے الفاظ بلبلے تھے جو اس کے حلق میں ہی پھوٹ رہے تھے۔ کبھی یہ چیخیں بڑی غم آگیں ہو جاتیں، کبھی تند اور غضب ناک۔ اتنے میں اس کے ہم جماعت لڑکوں کا دل پسیج گیا تھا۔ سلیٹ مارنے والا لڑکا خود اپنے آنسو نہ روک سکا تھا۔ ہم اس لڑکے کو دم دلاسا دے کر ایک ڈاکٹر کی دکان پر لے گئے، مرہم پٹی کروائی۔ پھر ان لڑکوں کے بتانے پر کہ اس کا گھر زیادہ دور نہیں، ہیں

اُسے گھر چھوڑنے کیلئے اس کے ساتھ ہو لیا۔

اگلے چوک پر دائیں طرف کا بازار "مکھی ماران" نچلے طبقے کے محلہ کی طرف لے جاتا تھا۔ ہم اُدھر بڑھ گئے۔ اس سڑک کو آمد و رفت کیلئے بند ہوئے ایک سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ مرمت کیلئے اسے کھودا اور اکھاڑا گیا تھا۔ جگہ جگہ کنکروں، ٹوٹے ہوئے پتھروں، ریت اور مٹی کے ڈھیر لگا دیئے گئے تھے۔ سڑک کے تھوڑے حصے کی مرمت بھی ہو گئی تھی۔ پھر اس علاقہ کے میونسپل کمشنر کی سرکاری بجلی چوری کرنے کے جرم میں گرفتاری کی وجہ سے اسے نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ رفتہ رفتہ لالٹینیں، لکڑی کے جنگلے وغیرہ سب غائب ہو گئے تھے اور مٹی کے ڈھیروں اور خودرو سبزے کے سوائے کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ ہم دونوں اس ناہموار سڑک پر ہولے ہولے احتیاط سے قدم بڑھاتے ہوئے اس کے گھر کی طرف ہو لئے۔

رات حیران کن تیزی سے اندھیرے مکانوں سے باہر رینگ رہی تھی۔ شکستہ کبیدہ خاطر سڑک پر کبودی سناٹا بیٹھا جا رہا تھا۔ آسمان میں ستارے آنکھیں کھول رہے تھے۔ لیکن ابھی وہ نیلے آسمان کے غیر محدود سمندر میں بنتے پھٹتے بلبلوں کی طرح معلوم دے رہے تھے۔ پھٹے پھٹے بادل اتنے بطی السیر تھے کہ نظر کو ان کی حرکت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ آفتاب کا گنجا پھیکے رنگ کا چہرہ اب سرد غبارہ کی طرح نیچے لٹک گیا تھا اور کھیت کرتے چاند کا دھوکا دے رہا تھا۔

تھوڑی دور جا کر ہم ایک تنگ متعفن کوچہ میں داخل ہوئے۔ یہ ایک ایسا محلہ تھا جہاں خدا کی اتنے افراط سے عطا کی ہوئی ہوا اور روشنی بھی بمشکل پہنچ سکتی تھی۔ تنگ اندھیری غلیظ گلی، اونچے اونچے مکانوں کبوتر خانوں میں گھٹی

ہوئی ہوا۔ دھوئیں سے لدی ہوئی، دزنی، یرقانی، بالکل ساکن۔ سارے محلہ پر غربت ایسے تنی ہوئی تھی جیسے ڈھول پر چمڑے کی جھلی کسی ہوئی ہے۔ راستے میں جگہ جگہ کھانسی کی آوازیں۔ مُردنی چھائے بے کیف کپاسی رنگ کے چہرے، بچّوں کی گندگی کے نشانات، شکستہ نالیوں سے ٹپکتا ہوا پانی۔ لوٹے ٹوٹے ہوئے حقے پر تالوں سے نکلتے فوارے منہ اٹھا کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ ایک جگہ ایک بُڑھیا چھوٹے سے کھٹولے پر ٹانگیں چوکھوٹی کیئے لیٹی ہوئی تھی۔ اور کُند آرے کی سی آواز میں خرّاٹے لے رہی تھی۔ ایک مکان کی تیسری منزل سے ایک آدمی ناریل کے حقے کو اوندھا کیئے پانی نیچے گرا رہا تھا اور جھاڑو کا تنکا اس کے آبنے میں پھیر رہا تھا۔ ایک مکان کی دہلیز سے بندھا ہوا کتّا اجنبی کو ادھر آتا دیکھ کر بڑی شدّت سے بھونکنے لگا۔ دوسرے آوارہ کتوں نے اس کی تقلید کی اور تمام کوچہ میں مشاعرہ برپا ہو گیا۔

وہ لڑکا ایک شکستہ نانک شاہی اینٹوں کی بنی ہوئی حویلی کے بالمقابل پہنچ کر رُک گیا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہو کر اس نے دائیں طرف کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور ایک سوکھے ہوئے مریل ادھیڑ عمر کے آدمی نے کواڑ کھول دیئے۔ غربت کی مکڑی نے اس کے چہرے پر جھرّیوں کا جالا بُن رکھا تھا۔ یہ جھرّیاں تنی ہوئی اور چوکس تھیں۔ اور اس کے قبل از وقت بڑھاپے کی دلالت کر رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کا منہ مسکرانے کی بے دل کوشش کرتے ہوئے ادھ کھلا رہ گیا۔ جیسے کہ وہ مجھے خوش آمدید کہنا چاہتا ہے۔ لیکن اس تنگ غلیظ ایک کمرہ کے مکان میں کسی کا خیر مقدم کرتے ہوئے شرم محسوس کر رہا ہے۔

اس کمرے میں مجھے جو کچھ دکھائی دیا بھیانک خواب کی طرح مجھے بے لبس کر رہا ہے۔ وہ افلاس اور فاقہ کشی کی انتہائی دلگیر تصویر تھی۔ ہر چیز پر دُکھ

اور بدنصیبی نے اپنی بے رحم مُہر ثبت کر رکھی تھی۔ مجھے کمرہ کے دروازے پر دیکھ کر چند لڑکیاں اور عورتیں جن کے پاس پورا لباس نہیں تھا غسل خانہ میں گھس گئیں۔ دروازہ کے قریب ایک عورت اپنی جگہ جگہ سے مسکی ہوئی دھوتی کے آنچل کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے چولھے میں سلگتی لکڑیوں کو پھونک رہی تھی۔ اگرچہ وہ بوڑھی معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن اس کی چمڑی ڈھلک رہی تھی سامنے کی طرف اُپلوں اور کباڑ کے ڈھیر کے قریب اس کمرہ کی ایک ہی چارپائی پر لیٹی ہوئی عورت شدید درد سے تڑپ اور کراہ رہی تھی۔ وہ میلے چکٹ تکئے پر ادھر اُدھر سر ٹپک رہی تھی۔ تکیہ جس کے درمیان میں بالکل سیاہ دائرہ پڑ چکا تھا۔ اس کا جسم کھانسی سے چُور ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ لیٹا ہوا ایک ننھا بچہ بڑے سکون سے انگوٹھا چوس رہا تھا۔ جگہ جگہ سے اکھڑے ہوئے لاتعداد نشانات، دھبّوں اور داغوں سے آلودہ خستہ حال دیوار کے ایک مچان پر کاغذ کے بے رنگ گرد آلود پھول، زنگ خوردہ پیتل کے پھول دان میں رکھے ہوئے تھے اور ان سب کی طرف بے حد ضبط اور استقلال کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ میری زبان تالو سے چمٹ گئی تھی۔ میں وہاں کھڑا نہ رہ سکا۔ اس کے بعد مجھے اپنے دل میں ایک دہشت ناک آواز سنائی دینے لگی۔ اس کی گونج ہر لمحہ پُر شور ہوتی جا رہی تھی۔ اذیّت خیز ہتوڑے کی طرح دماغ میں ضربیں لگاتی ہوئی صدا۔ رحم اور ہمدردی کا جذبہ میرے تھکا ن سے دہکتے جسم میں بڑی شدّت سے کپکپا رہا تھا۔

اگلے دن میں نے دفتر کے چند ضروری رجسٹر غائب کر دیئے اور وہ اس وقت تک انھیں پانے میں کامیاب نہ ہو سکے جب تک میری ضمانت کی رقم مجھے وصول نہ ہو گئی۔ اسی شام میں اس غریب آدمی کے گھر پہنچا۔ ایک اضطراری زوجسی میری

پیٹھ سے نیچے رینگ رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ سر باہر نکالنے پر میں نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہاں سے تھوڑی دور تنزولی زمین کا قطعہ تھا جس پر گندگی اور غلاظت جلانے کی بھٹی بنی ہوتی تھی۔ ہم اس زمین کے کنارے پر جا کر بیٹھ گئے۔ اس کے متعلق اِدھر اُدھر کی باتیں دریافت کرنے کے بعد میں نے مناسب موقع پر اُسے مالی امداد دینے کی رضامندی ظاہر کرتے ہوئے اپنی جیب سے تمام رقم نکال کر اس کی مٹھی میں زبردستی دے دی۔ وہ اپنے خمیدہ شانے اچکا کر میری طرف تکنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہ رتی بھر امید نہ ہونے کے باوجود بھی لوگوں سے مالی امداد مانگنے کا عادی رہے۔ اور اب حیران ہو رہا ہے کہ جب مانگتے مانگتے زبان گھس جانے پر بھی لوگ اس ٹٹپونجئے کو پھوٹی کوڑی کے قابل نہیں سمجھتے تو اس بے مانگی دولت کا کیا راز ہے؟

میرے زور دینے اور خلوص نیت کا یقین دلانے پر وہ اس رقم کو لینے پر راضی ہو گیا۔ لیکن بطور قرضہ ———— وہ مجھے اپنی آپ بیتی سنانے لگا۔ کبھی وہ بھی آسودہ حال تھا۔ صاحب رتبہ، ایک مشہور مل کا خزانچی۔ زندگی میں اس نے بھی بہت نیکیاں کی تھیں۔ لیکن ان کا پھل ہمیشہ کڑوا نکلا تھا۔ ایک دفعہ وہ کسی کام سے دہلی گیا تھا۔ گاڑی وہاں صبح منہ اندھیرے پہنچتی تھی اور اس لئے اپنے ایک دوست کو اس کی اطلاع دے رکھی تھی لیکن وہ اسٹیشن پر نہیں تھا۔ تلاش بسیار کے بعد جب وہ اس کے گھر پہنچا تو وہاں ماتم برپا تھا۔ پھر دم جب وہ اسٹیشن کی طرف ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جو اس کے گھر کے قریب سے گذرتی تھی جا رہا تھا تو گاڑی کے نیچے آ کر جان کھو بیٹھا۔ اس وقت سے اس کی بیوی اور جوان لڑکا اس آدمی کے ساتھ رہنے لگے۔ اس لڑکے سے وہ اپنی لڑکی

کی طرح محبت کرتا تھا۔ اور وہ اس کے پاس بل میں کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔ ایک دن آنکھ بچا کر وہ اٹھارہ ہزار روپئے لیکر چمپت ہو گیا۔ اور اسے نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے۔ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھیگ آئی تھیں اور آنسوؤں کی موٹی موٹی بوندیں اس کی پلکوں میں جھلملا رہی تھیں۔ وہ گردن جھکا کر احساس بھرے لہجے میں بڑبڑانے لگا کہ اب وہ ایک نئی زندگی شروع کر سکے گا۔ گھر میں سب بیمار ہیں، بھوکے ہیں، ان کی دیکھ بھال کر سکے گا۔ اپنے لڑکے کو اچھی تعلیم دے سکے گا۔ تاکہ وہ خاندان کو غربت کی کیچڑ سے نکال کر پھر کسی رتبہ تک پہنچا سکے۔

گندگی جلانے کی بھٹی متعفن دھواں اگل رہی تھی۔ اور اس کے پیچھے کی طرف پرانے بوسیدہ مکان کی دیوار میں سے پیپل کا درخت اُگ رہا تھا جس کی ایک شاخ میں کٹی ہوئی پتنگ ڈیڑھ گز دھاگے سے لٹک رہی تھی۔ شاخ جو کسی محتاج اپاہج کے ہاتھ کی طرح آگے بڑھی ہوئی تھی اور وہ پتنگ ہوا میں متذبذب دل کی طرح ہوا میں ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔

اس واقعہ کے پورے تین ہفتے بعد کچہری میں ایک کا پلیسٹ کی ملازمت کیلئے انٹرویو کرنے گیا ہوا تھا۔ میں اس غریب لڑکے کو چپراسی کی وردی پہنے ایک کمرے کے باہر سٹول پر بیٹھا دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ پہلے سے بھی لاغر ہو چکا تھا اور میں اسے بڑی مشکل سے پہچان سکا تھا۔

اس سے مجھے معلوم ہوا کہ روپیہ لیکر گھر پہنچنے پر وہ آدمی ہر وقت صبح شام پرماتما سے رو رو کر اپنی کامیابی کے لئے دعائیں مانگتا رہا۔ اور پھر اس نے ان روپیوں سے جوئے کی بازی لگائی تاکہ نئی زندگی شروع کرنے کیلئے کافی روپیہ ہاتھ لگ جائے۔ لیکن اس کی ہار ہوئی اور اس صدمے سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔

کچہری سے باہر نکل کر میں نیم کے درخت کے نیچے بنچ پر جا بیٹھا۔ اس کے

بیچ باہم کش مکش کرتی دھوپ چھاؤں میں نیم کی کڑوی نبولیاں بکھری پڑی تھیں۔ جوتوں کی رگڑ سے کھدا ہوا چھوٹا سا گڑھا بارش کے پانی سے بھرا ہوا تھا۔ ساکن، محدود انسانی زندگی کی طرح پھیلاؤ اور بہاؤ سے محروم۔ اس میں جھلملاتے چہرے پر میری نظر پڑی۔ میں نے ایسا المناک چہرہ آج تک نہیں دیکھا۔ دُکھ، مایوسی، دل شکستگی!!!
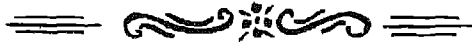
چار دن کی چاندنی

شانتی خواب آلودہ جماہی لیتے ہوئے کوئلہ کھانے سے سیاہ ہوئے جبڑے پھیلا کر پھر اونگھنے لگی۔ دائیں طرف طاقچے میں ٹمٹماتی ہوئی کپی کی بتی پر گُل جم آیا تھا۔ اور وہ دھوئیں کی لمبی لکیر اُگل رہی تھی۔ شانتی کی لڑکی نمو کی دودھ چوستے چوستے آنکھ لگ گئی تھی۔ اور اس کی چھاتی خالی مشک کی طرح ایک طرف لٹک رہی تھی۔ نمو کا بکھرے ہوئے لیکھوں بھرے خشک مٹیالے بالوں والا سر جو اس کے چرخ مریل جسم کے مقابلہ میں بھی بہت چھوٹا تھا۔ ابھی تک ماں کی لٹکتی ہوئی چھاتی کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ شانتی کے ذہن کو ایک خیال بار بار سہلا رہا تھا کہ نمو رات کو نہ جاگ اٹھے اور پھر اس کیلئے نیند حرام ہو جائے۔ مٹی چونہ کھانے سے نمو کے پیٹ میں کیڑے پیدا ہو چکے تھے۔ جو رات بھر اسے تنگ کرتے رہتے

تھے۔ وہ اس درد کی وجہ سے روتی چیختی رہتی تھی۔ اور اس کی ماں بھی پلک بھر کے نیند نہ لے سکتی تھی۔ اس طرح کئی ہفتے گذر گئے تھے۔ شانتی اب بھی اسی سوچ میں غلطاں تھی۔

پاس کی چارپائی میں ایک اُداس چرچراہٹ پیدا ہوئی۔ ابھی تک اسکی جیٹھانی سوئی نہیں تھی۔ وہ حسب معمول آنکھوں کو میلی راکھ بھری مٹھیوں سے مسل رہی تھی۔ اس کی خاکستری ہمیشہ پُرنم رہنے والی آنکھیں ککروں سے آماس آئی تھیں۔ پپوٹے ورم کر گئے تھے۔ پلکیں جھڑ کر آنکھوں میں گرتیں اور چبھن سے درد پیدا کرتیں۔ جسے کم کرنے کیلئے وہ انھیں خوب رگڑتی اور مسلتی یہاں تک کہ اس کی آنکھیں اب بالکل کھائی سی سُرخی مائل اور موٹی پڑ گئی تھیں وہ عموماً بائیں ہاتھ سے مالا پھیرتی رہتی۔ دائیں سے آنکھیں مسلتی یا پاؤں کی پھٹی ہوئی تلیاں کھجاتی رہتی اور اس کا دانتوں سے خالی کپڑے کے بند بٹوہ سا منہ رام رام گنگنانے کی کوشش میں اس طرح حرکت کرتا رہتا جیسے وہ کچھ چبا رہی رہے۔ وہ کسی قسم کا مطالبہ یا تقاضہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے متعلق کوئی کچھ بھی تصور نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی زندگی بالکل کوری تھی جیسے کتاب کا خالی صفحہ۔

اس کے ساتھ والی چارپائی پر شانتی کا لڑکا اور لڑکی سو رہے تھے۔ سارا دن وہ آپس میں بڑی شدت سے لڑتے رہتے تھے۔ صرف رات کو سوتے ہوئے خود بخود ان کی باہیں ایک دوسرے کی گردن میں اردگرد لپیٹ جاتیں۔ یہ لڑکا بڑے لڑکے کے سات ماہ بعد پیدا ہوا تھا۔ اس لئے وہ خلافِ معمول اور غیر قدرتی قسم کا بچہ تھا۔ اس کی چمڑی کا رنگ پیازی مائل دودھیا تھا۔ اس کے بے رنگ بال قریب قریب غیر مرئی تھے اور اس کی نیم بینا آنکھوں کے سیاہ دائرے

معمول سے بہت چھوٹے تھے۔ شانتی کی لڑکی بھی کچھ پگلی سی تھی۔ چند سال ہوئے اسے کتے نے کاٹا تھا۔ کتا تو پاگل نہیں تھا لیکن انجکشنوں کے زہر سے وہ پاگل ہوگئی تھی۔ اور اس کا جسم ہمیشہ اَنھوریوں اور پھنسیوں سے بھرا رہتا تھا۔ اولاد کی طرف سے کسی قسم کی امید ہونے کی بجائے شانتی کیلئے یہ ایک دائم بار تھا۔ یہ لڑکا اور لڑکی کبھی بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں تھے۔ ماں کی مامتا سے مجبور اسے ان کے مستقبل کے لئے بھی کوڑی کوڑی جمع کرنی پڑتی تھی۔

شانتی پھر جماہی لے کر اپنے سر کے سفید بال کھجانے لگی۔ اس کے چکنے بال کھوپڑی پر چپکے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اس کی کنپٹیاں اور ماتھا ابھری ہوئی لنتور کی ننھی ننھی نیلی رگوں سے بھر آیا تھا۔ وہ نیند کے غلبہ میں بے بس ہو کر انگڑائیاں بھرنے لگی۔ اور اس کے جسم سے چٹاخ چھوٹ رہے تھے۔ وہ بہت بے بسی سے سوچنے لگی کہ اس شام گھر کے آگے سے گذرتے ہوئے ایک گائے دہلیز چاٹنے لگ گئی تھی۔ لیکن اس ابھاگن کیلئے خوش قسمتی کے اس نشان کے کیا معنی۔ تصور نے اس کی آنکھوں کے سامنے تمام غم آگیں زندگی پیش کر دی۔ اور گذشتہ واقعات یکے بعد دیگرے اس کی آنکھوں کے آگے گھومنے لگے۔

شانتی ابھی تک اونگھ رہی تھی کہ اُسے باہر قدموں کی چاپ اور دروازے پر ہلکی سُبک دستک سنائی دی۔ جیسے کتا کان پٹپٹا رہا ہے۔ پہلے تو وہ خاموش رہی جب یہ آوازیں بند نہ ہوئیں تو اس نے بے دلی سے اُٹھ کر دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ اپنے لڑکے ہرنام داس کو وہاں دیکھ کر شانتی کے تعجب کی کوئی حد نہ رہی۔ اسے آنکھوں پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔ وہ آنکھیں جھپکتی ہوئی اسے ایسے دیکھنے لگی جیسے بنیا کھوٹا سکہ پرکھتا ہے۔ اتنے میں ہرنام داس ماں کہتا ہوا اس سے چمٹ گیا۔

ہرنام داس شروع ہی سے بدقماش اور آوارہ تھا۔ تین سال ہوئے جب وہ چودہ سال کا تھا۔ اس نے ساتھ والے مکان میں نقب لگا کر پانچ ہزار کے زیورات پر ہاتھ صاف کیا۔ عمر اور تجربہ کا پختہ نہ ہونے کی وجہ سے پولیس کو جلد سُراغ مل گیا اور ڈیڑھ سال سزا ہوئی۔ جب رہا ہوا تو بہت ہی شریف اور زاہد بن چکا تھا۔ صبح شام مندر میں پوجا اور سندھیا ہوتی۔ ہر منگل وار ہنومان کی کھاسی جاتی۔ باقاعدہ سنگاند۔ اماوش اور پورن ماشی کے برت رکھے جاتے۔ سب کو یقین ہو گیا تھا کہ ہرنام داس اب بے حد نیک، راستباز اور پارسا بن گیا ہے۔ اُسے پشمینے کے ایک تھوک سوداگر کی دکان پر ملازم کرا دیا گیا۔ ماں خوش تھی کہ آخر اس کا لڑکا اس کے دُکھوں میں شریک ہونے کے قابل ہو گیا ہے۔ وہ ہر وقت بیٹے کے گن گاتی رہتی۔ لیکن ابھی ہرنام داس کو ملازمت کرتے پانچ مہینے بھی نہیں ہوئے تھے کہ وہ موقع پا کر وہاں سے ڈیڑھ ہزار روپیہ نقد اڑا کر غائب ہو گیا۔ اخباروں میں اشتہار دیئے گئے۔ انعام رکھا گیا۔ لیکن اس کی کوئی اطلاع نہ ملی۔ اب گیارہ ماہ بعد وہ خود بخود لوٹ آیا تھا۔ پہلے تو بیٹے کو دیکھ کر شانتی کے دل میں غصہ اور نفرت کا طوفان اُمنڈ آیا۔ لیکن جوتیں پڑ جانے پر گدڑی پھینک نہیں دی جاتی۔ آخر کار ماں کی ممتا کی فتح ہوئی شانتی نے بیٹے کو گلے سے لگا لیا۔ اور آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکی۔

ہفتہ بھر تو ہرنام داس نے بالکل خاموشی اختیار کئے رکھی۔ کسی سے بات نہ کی کسی کے سوالات کا جواب نہ دیا۔ اسے دو وقت کھانا تک بڑی مشکل سے کھلایا جاتا تھا۔ بالآخر اس نے مُہرِ سکوت توڑی۔ وہ ماں کے پاؤں پر گر گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ اور ہمیشہ کے لئے فرماں بردار اور شریف بنے رہنے کی قسمیں کھانے لگا۔ وہ ماں سے کہنے لگا کہ اب وہ بے حد بدنام ہو چکا ہے۔ ملازم رکھنا تو درکنار آج کوئی

اپنی دوکان کے قریب بھی پھٹکنے نہیں دے گا۔ اس لئے بہتر ہوگا کہ وہ کوئی خوانچہ لگالے اور اس طرح اپنی دُکھیا ماں کا ہاتھ بٹائے۔

اگلے دن ہرنام داس ایک پڑوسی لڑکے سے پانچ روپیئے کا نوٹ چھین کر بھاگ گیا۔ رات کو بڑی دیر بعد گھر آیا اور پھر صبح سویرے غائب ہوگیا۔ دوپہر کے وقت جب وہ محلہ میں داخل ہوا تو اس کا حلیہ اور ہی تھا۔ اس نے پہلوانوں کی طرح کی ریشمی پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ پانچ گھوڑے کی بوسکی کا کرتہ، اپیلینٹ لیدر کی گرگابی دانتوں پر سونے کے پترے، آبنِ سوچھتر کی ململ کی نیلی دھوتی۔ جس میں سے اس کے استرے سے مُنڈی ہوئی رانیں اور پنڈلیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے ساتھ پھلوں اور مٹھائی کی ٹوکریاں اور ماں کیلئے قیمتی کپڑے تھے۔ اس نے فوراً جاکر پڑوسی کے لڑکے کے پانچ روپیئے واپس کردیئے۔

دو دن میں سارے مکان کی حالت سُدھر گئی۔ ٹوٹے پھوٹے کی مرمت، سپیدی رنگ روغن، پردے اور دریوں نے کچھ اور رنگ جما دیا۔ بجلی کا کنکشن بحال ہوگیا بیٹھک چادروں، غالیچے اور گاؤ تکیوں سے آراستہ ہوگئی۔ شری رام چندر اور کرشن جی کی تصویریں اور ننگی عورتوں کے جاپانی کیلنڈر دیواروں کی زینت دوچند کرنے لگے۔ ہر وقت مٹھائی اور پھلوں سے گھر بھرپور رہتا۔ شانتی حیران تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ دریافت کئے جانے پر ہرنام داس صرف یہی بتاتا کہ پڑوسی لڑکے سے چھینے ہوئے پانچ روپئوں سے اس نے سٹّہ کھیلا تھا۔ لگایا ہوا نمبر نکلنے پر اسے پچاس روپیئے حاصل ہوئے اور دوبارہ نمبر لگانے پر پھر اسکی کامیابی نصیب ہوئی۔ اور وہ پانچ روپیئے پانچسو روپیئے میں تبدیل ہوگئے۔ وہ ماں کو یہ بھی بتاتا کہ چند اور لوگوں کی شمولیت سے اس نے جوا خانہ جاری کیا ہے۔ دولت اور روں کی بے اُجڑے گی اور وہ اپنے حصّے کی کمیشن سے علیش اُڑائیگا۔

ہرنام داس کے لچے لفنگے اور آوارہ ملاقاتیوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ سارا دن "ہرنامے سیٹھ"، "ہرنامے پہلوان" کی آوازیں لگانے والوں کا تانتا لگا رہتا۔ صبح ڈنڈ پیلے اور بادام رگڑے جاتے۔ ہر رات شراب کا دور چلتا اور نت نئی عورتوں سے رنگ رلیاں منائی جاتیں۔

ہرنام داس نے گھر کے کام کاج کیلئے ملازم رکھ لیا اور ماں کو کسی کام کو بھی ہاتھ نہ لگانے دیتا تھا۔ منع کرنے کے باوجود ہر روز اس کے اور بھائی بہنوں کے لئے نئے نئے کپڑے خرید لاتا۔ شام ہوتے ہی ایک تانگہ ان کی ہوا خوری کیلئے مکان کے آگے آکھڑا ہوتا۔ اس نے ماں کے لئے ایک ایک انچ موٹے لفظوں والی گیتا لادی، سُرا گائے کی دم کا چنور، گیتا جو اس لمبی چوڑی چھپائی کی وجہ سے بہت لمبے چوڑے ضخیم گرنتھ کی صورت میں تھی کو سنبھال کر رکھنے کیلئے رکت چندن کا پیڑھا۔ شانتی کو یہ بارُعب گیتا بہت پسند آئی تھی۔ اور وہ صبح شام اس کا پاٹھ کرتی رہتی۔

نائی کیلئے بھی اس نے چھوٹی چھوٹی کوڑیوں کی مالا لادی۔ کئی سال ہوئے خاوند کے سرادھ منانے کیلئے اس نے اپنے مصنوعی دانت فروخت کر دیئے تھے۔ اب دانتوں کا نیا جوڑا اسے بنوا دیا گیا۔ اس کے پاس اپنے مرحوم خاوند کی ایک ہی یادگار باقی تھی، گھِسے ہوئے تُرلے بوٹ جنہیں اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں پر چڑھانے کیلئے وہ دایاں پاؤں بائیں میں اور بایاں دائیں میں پہنا کرتی تھی۔ ہرنام داس اس کے لئے نئے جوتے لے آیا لیکن وہ ان کو بھی ویسے ہی پہننے کی کوشش کرتی رہی۔ اور تمام دن اسی کوشش میں مصروف رہتی۔

ہرنام داس چھوٹی عمر سے ہی بڑا مغرور اور خود پسند واقع ہوا تھا۔ ماں بھائی اور بہنوں میں عدم دلچسپی کے احساس کو اس نے چھپانے کی کبھی کوشش نہیں

تھی ۔ جو اس کے اس دُنیا میں لانے کے ذمہ دار تھے ان کی طرف اس نے شاذ و نادر ہی کوئی پابندی یا فرض محسوس کیا تھا ۔ اب وہ تمام رشتے داروں میں بڑی شوق اور ہمدردی کا اظہار کر رہا تھا ۔ ماں کی طرف تو اس کی عقیدت بہت ہی بڑھ گئی تھی ۔ معمول کے خلاف فرصت کے وقت وہ ماں کے پاس آ بیٹھتا ۔ بہن بھائی کے مستقبل کے متعلق صلاح و مشورہ کرتا رہتا اور گپیں ہانکتا ۔ کہ بہن کی شادی شہر کے باہر کسی کوٹھی میں دھوم دھام سے کرے گا کہ سارا شہر عش عش کر اُٹھے گا ۔ شانتی ان باتوں پر بہت خوش ہوا کرتی ۔

جب شانتی ہرنام داس کو فضول خرچی سے منع کرتی اور سنبھال کر رکھنے کے لئے اس کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے نوٹوں کو چھیننے کی کوشش کرتی تو وہ کہتا کہ ماں بے فکر رہو ۔ روپیہ بنانے کی مشین اب میرے ہاتھ لگ چکی ہے ۔ جب کہ ہرنام داس سے اس کی آمدنی کے ذرائع کے بارے میں استفسار کرتی تو اس کا رنگ اُڑ سا پڑ جاتا ۔ اور وہ کندھے اچکا کر بھویں سکیڑ کر ایک کالی لکیر بنا لیتا ۔ اور مسکرا کر بات کو ٹالنے کی کوشش کرتا ۔ جیسے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے ۔ لیکن جب شانتی اپنے سوالوں کو دوہراتی تو ہرنام داس بڑی سرعت سے اسی جوا خانہ کا ذکر کر دیتا ۔ اور ایک ٹھنڈا سا سانس لیکر اپنے جسم کو لمبے سہلانے لگتا ۔ جیسے اسے کانٹے چُبھ رہے ہیں ۔ اور وہ قمیض میں ہاتھ ڈال کر پیٹھ زور زور سے مسلنے لگ جاتا جیسے وہاں کوئی کیڑا یا کھٹمل جا گھسا ہے ۔ وہ اُچھل بچھل ناچنے لگ جاتا ۔ ماں کو جیل کی کہانیاں سُنانے لگ جاتا ، کہ جیل میں ایک عورت بھی قید تھی ۔ اس کے ساتھ اس کا آٹھ ماہ کا بچہ بھی تھا ۔ ایک دن اس بچے نے ریت اور لکڑی کا بُرادہ ملے آٹے کی قیدیوں کی روٹی نگل لی ۔ اور نیم جان ہو کر درد سے تڑپنے لگا ۔ تمام قیدی وہاں یہ دیکھنے کیلئے اکٹھے ہو گئے کہ وہ عورت کیسے روتی اور چیختی ہے ۔ کبھی وہ آزردہ

خاطر ہو کر کہتا کہ ماں جیل میں میری غم گینی کی کوئی حد ہی نہ تھی۔ اور میں تمھیں یاد کر کے آنسو رویا کرتا تھا کہ میرا تکیہ پانی پانی ہو جایا کرتا تھا۔ ایسی کہانیاں سنانے کے بعد کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا وہ وہاں سے اُٹھ کر چلا جاتا۔

شانتی سوچنے لگ جاتی کہ وہ بغیر کسی وجہ کے کتنی آسانی سے جھوٹ بول سکتا ہے۔ جیل میں جب بھی وہ اسے ملنے گئی اس نے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی اور اس کے پاس تکیہ تو درکنار بستر کے طور پر ایک دری بھی نہیں تھی۔ جب کبھی وہ ہرنام داس سے کہتی۔ بیٹا یہ جوئے کا پاکھنڈ کتنی دیر جاری رہے گا۔ کبھی نہ کبھی تو پولیس اسے بند کروا دیگی۔ تو اس کا جواب تیار تھا کہ وہ اُن بُزدل لوگوں میں سے نہیں ہے جو اپنے ہاتھوں تو تنکا بھی نہیں توڑتے لیکن قسمت پر ایسے بھو نکتے رہتے ہیں جیسے کتا چاند پر۔ جب پولیس جوا خانہ بند کروا دے گی تو وہ لوگوں کو اُلو بنانے کیلئے کوئی اور داؤں کھیل لے گا۔ جب شانتی بیٹے کو بازاری عورتیں اور شراب گھر لانے سے تائب ہو جانے کی ترغیب دیتی تو وہ قطعی بے حس وحرکت ہو جاتا۔ جیسے اس کی بات کے دوسرے کان میں سے باہر نکل جانے میں مخل نہیں ہونا چاہتا۔ یا بگڑ کر کہتا کہ وہ ان انسانوں میں سے نہیں جو اپنی چار روزہ زندگی کو خدا اور بیوی، سے ڈرنے میں گذار دیتے ہیں۔ لیکن جب ماں ناراض ہونے لگتی تو وہ تسلی دیتا کہ وہ ان چیزوں کا مزا صرف اس لئے چکھ رہا ہے تاکہ بعد میں کوئی حسرت سلگتی نہ رہے۔ اور جلد ہی وہ اتنا شریف اور نیک طبع بن جائیگا کہ چراغ لیکر ڈھونڈھنے سے بھی کوئی ایسا نہ ملے گا۔

ہر طرف سے ہرنام داس کے ناتہ کے پیغام آنے لگے۔ زندگی میں پہلی دفعہ لوگ شانتی کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے تھے اور اس سے عزت کا برتاؤ کر رہے تھے، وہ کسی کے ساتھ پختہ فیصلہ نہ کرتی۔ کیونکہ اسے ان منتوں اور التجاؤں بہت لطف

محسوس ہو رہا تھا۔ اور وہ اس سلسلے کو ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ہرنام داس بھی یقین دلاتا کہ ماں ہیں بیوی بالکل تمھاری منشا کے مطابق لوں گا۔ ایسی جو تمھیں سُکھ دے۔ تم رانی بن کر بیٹھو اور وہ داسی کی طرح ہاتھ باندھے حکم بجالاتی رہے۔ بس ذرا سوچ سمجھ کر انتخاب کرنا۔ آج کل کی لڑکیوں کو تو بینگن کا اچار تک ڈالنا نہیں آتا۔

دُکھوں کے اندھیارے میں ساری عمر گذاری تھی۔ اس اچانک عزت، آرام اور خوشی نے شانتی کو چکاچوند کر دیا تھا۔ وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھی اور گرد و پیش ہو رہے تماشے کو طفلانہ حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ کسی بدفالی کی منحوس سنسناہٹ ہمیشہ اس کے کانوں میں سنسناتی رہتی۔ ایک مبہم ڈر اس کے دل میں کپکپی سی طاری رکھتا۔ ڈر جس سے وہ دُور رہنا چاہتی تھی۔ لیکن یہ اس کے جسم کا حصہ بن گیا تھا۔ اور ہمیشہ اس کے ساتھ لٹکتا رہتا۔ اس پر ایک کپکپی طاری رہتی جیسے وہ ناخنوں سے میلا غلیظ برتن کرید رہی ہو۔ ہرنام داس گلی محلہ والوں اور یار دوستوں میں روپیہ پانی کی طرح بہا رہا تھا۔ اور وہ ان سب حرکات کی وجہ تک معلوم کرنے سے خائف تھی۔ محلہ میں کوئی کہتا کہ چوری کا مال موری میں بہا جا رہا ہے۔ کبھی وہ اُڑتی اُڑتی سن لیتی کہ رانڈ کا سانڈ صرافہ بازار میں زیور فروخت کر رہا تھا۔ وہ خاموش رہتی اور ان باتوں پر سوچنے تک کی جرأت نہ کر سکتی۔

اس صورتِ حال کے باوجود سب لوگ اب شانتی کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ محلہ کی عورتیں اس سے صلاح مشورہ کے لئے آتیں۔ جب کوئی نئے خریدتیں تو سب سے پہلے اسے دکھاتیں۔ لڑکوں کا اس سے ٹھٹھا مخول تو در کنار کوئی اسے ماتاجی کے بغیر مخاطب کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ آپس کی لڑائیوں میں عورتیں اُسے پنچ بناتیں۔ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کچھ بھی کرنے کی ہمت نہ کرتا۔ ہفتہ عشرہ ہی

ہیں شانتی کی دُنیا میں حیران کُن تغیر و قوع پذیر ہو چکا تھا۔

ایک صبح ہرنام داس کے ہاتھ میں نوٹوں کا پُلندا تھا۔ شانتی نے اس سے یہ نوٹ سنبھال کر رکھنے کیلئے بہت دفعہ مانگے۔ لیکن وہ ہر دفعہ کسی نہ کسی بہانے ٹال دیتا۔ آخر ہرنام داس نے اس شرط پر اُس کو ایک سو روپیہ دیدیا کہ وہ اسے سنبھال کر نہیں رکھے گی۔ اور شام سے پہلے پہلے یہ سب خرچ کر ڈالے گی۔ جب شانتی نے ان ایک سو روپے کے نوٹوں کو سنبھال کر رکھنے کیلئے صندوق کھولا تو وہ یہ دیکھ کر غش کھا کر گر پڑی کہ اس کا اتنے برسوں سے سنبھال کر رکھا ہوا جہیز کا تمام زیور اور محنت مشقت سے کوڑی کوڑی کر کے اکٹھی کی ہوئی تمام پونجی غائب تھی۔
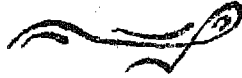
عورت اور حُسن

ہمارے کالج میں مسٹر آئی ڈی بُچر انگریزی ادب کا معلّم تھا۔ جب کبھی شعر و نظم پڑھاتے وقت حُسن و محبت کا حوالہ آجاتا تو وہ ناک مُنہ چڑھا کر بڑے حقارت آمیز انداز میں اس کا ذکر کرنے لگتا۔ کبھی کہتا کہ یہ حُسن ہماری تہذیب کا پلیگ ہے۔ کبھی کہتا کہ یہ خوبصورتی ایک سزا ہے جو خدا نے حوّا کی بیٹیوں کو آدم کو گندم کھانے کا مشورہ دینے کے عوض میں دی ہے۔ یہ ایک معیوب دھوکا ہے۔ زہر ہلاہل۔ اور یہ خوبصورت عورتیں ایک قسم کی کھونٹیاں ہیں جن پر یہ زرق برق کپڑے ٹانگے جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کہتا رہتا تھا کہ اس حُسن کا خدا کی تخلیق میں اتنا ہی کم وجود ہے جتنا نیکی کا انسان کی زندگی میں۔ یہ قدرت تو ہر قسم کی اعجوبیت، بدنمائی اور وحشت انگیزی کا بے ترتیب مُرکّب ہے۔ اس میں حُسن اور محبت کہاں۔ یہ گلاب، یہ کلیاں، یہ حسین چہرے سب

ہماری اپنی ایجادات ہیں ۔ یہ حسن عورت نے ایجاد کیا ہے تاکہ اس ہتھیار سے وہ مرد کو غلام بنائے رکھے ۔ یہ حسن دماغ کی غیر موجودگی کی نشانی ہے ۔ جتنا خوبصورت پرندہ اتنا ہی دماغ سے خالی ، اور جتنی یہ عورتیں خوبصورت بننے کی کوشش کرتی جا رہی ہیں اتنی ہی وہ عقل سے محروم ہوتی جائیں گی ۔ کبھی وہ اس بات پر زور دینے لگتا کہ حسن کی ضرورت ہی کیا ہے ۔ جب کہ عورتوں کو اسی طرح بچے پیدا کرنے ہیں جیسے چوہیا کو ۔

میرے بہت سے ہم جماعتوں کا خیال تھا کہ غالباً پروفیسر صاحب کی بیوی بہت بدصورت ہے اور یہی حسرت نفرت میں تبدیل ہو گئی ہے ۔ کوئی انگور کھٹے ہیں کی مثال دے دیتا ۔ کوئی اس نکٹے کی کہانی سنانے لگتا جو اپنی ناک کٹ جانے پر اوروں کو یہ کہہ کر ناک کٹوانے کی دعوت دینے لگا تھا کہ ناک کٹوانے سے خدا نظر آجاتا ہے لیکن مجھے اس لفظی گورکھ دھندے کے پس منظر میں کوئی بہت ہی سنجیدہ پُر معنی واقعہ کھٹکتا ہوا محسوس ہوا کرتا تھا ۔ جس نے حسن سے پروفیسر صاحب کا دل کھٹا کر دیا تھا ۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ باتیں سطحی نہیں بلکہ ایک جلے ہوئے پھپھولوں سے بھرے ہوئے دل کی آہیں ہیں ۔

جب کبھی گفتگو کے دوران میں میں پروفیسر بھجر کا دل ٹٹولنے کی کوشش کرتا تو وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتا ۔ معنی خیز سنجیدگی سے اٹی ہوئی ہنسی ۔ اور پھر وہی اپنے پسندیدہ نوک دار فقرے اگلنے لگتا " یہ حسن سزا نہیں تو اور کیا ہے ۔ ہمیشہ آئینہ سے چمٹے رہنے کی سزا ۔ یہ حسن دھوکا نہیں تو اور کیا ہے ۔ اس سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے ۔ یہ ہمیں ہر چیز سے غافل کر دیتا ہے " جب وہ بنے سنورے فقرات یا مسکراہٹ کے آنچل میں اپنے احساس کو چھپانے کی کوشش کرتا تو میرا یقین اور بھی پختہ ہو جاتا ۔ جوں جوں وہ اس راز کو چھپاتا جاتا میرے دل میں اسے معلوم کرنے کا اشتیاق

اتنا ہی بڑھتا جاتا۔ کئی دفعہ میں گھوم گھام کر باتیں اسی طرف لانے کی کوشش کرتا۔
لیکن وہ صاف ہی کسی اور موضوع کی طرف نکل جاتا۔ لیکن ایک دن میں نے اسے
راہ پر ڈال ہی لیا۔ اور وہ اپنی کہانی سنانے پر تیار ہو گیا۔ پہلے تو اس نے سر نیچے
لٹکا کر اپنے آپ کو ماضی کی یاد میں لپیٹ لیا۔ پھر اس نے آنکھوں کو میری طرف پھیر
کر ہچکچاتے ہوئے مضمحل لہجے میں اپنی کہانی سنانی شروع کی ــــ

"جن دنوں کا میں اب ذکر کر رہا ہوں ان دنوں بھی مجھے اس نسوانی حسن،
اس رنگ و روپ میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ اس کی وجہ اور تھی۔ ان دنوں میں
عجیب سی تصوری اور مثالیت پسند حالت میں تھا۔ میرے خیال میں حسن کا پرستار
تو ہر شخص ہو سکتا ہے لیکن حسن کی تخلیق کرنے والا امرِ خدا کبھی کبھی پیدا ہوا کرتا ہے۔
میرے سر پر اُن دنوں حسن کا خالق بننے کا بھوت سوار تھا۔ ان دنوں مجھے فنونِ
لطیفہ کا بیحد شوق تھا۔ میں خود حسن کو خلق کرنا چاہتا تھا۔ خدا کے بنائے ہوئے نسوانی
حسن سے زیادہ پائیدار حسن۔

میں اسی کالج سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور
میں ایم۔ اے میں داخل ہو گیا تھا۔ ان دنوں اس کالج کی فورتھ ایئر کلاس میں ایک
انتہائی خوبصورت لڑکی پڑھا کرتی تھی۔ سیالکوٹ کی ایک بیوہ کی دُختر۔ وہ لاہور
کے ایک گرلز ہوسٹل میں رہا کرتی تھی۔ سنیچر کی شام کو وہ سیالکوٹ چلی جایا کرتی تھی
اور سوموار کی صبح لوٹ آیا کرتی تھی۔

کالج کے لڑکوں کو پڑھنا پڑھانا تو کیا تھا سب اس لڑکی سے دل لگی، چھیڑ چھاڑ
عشق بازی کرتے رہتے تھے۔ اس کا حسن بھی کچھ ایسا جاذب تھا کہ کوئی اس کے طلسمی
اثر سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس کا غیر معمولی پُرکشش چہرہ تھا۔ آج
بھی وہ صورت میری آنکھوں کے سامنے اتنی ہی وضاحت سے گھوم رہی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ ہوا میں کسی چیز کو گھورنے اور بڑبڑانے لگا!! بس سمجھ لو کہ رخساروں کی جگہ دو نو شگفتہ پھول ہیں اور ان میں بند کلی سی لمبی تیکھی ناک۔ لمبی لمبی پلکوں میں چھپی ہوئی تیتری کے پروں کی مانند ہلکی پھلکی آنکھیں۔ اور گھنی گھنگریالی زلفوں میں دودھیا مانگ ــــــ کلاس روم میں یا باہر سب کی آنکھیں اس کی طرف ہی جمی رہتی تھیں۔ جب وہ سائیکل پر سوار ہو کر اپنے ہوسٹل کی طرف جاتی تو اس کے پیچھے پیچھے سائیکلوں کی قطاریں ہوتیں۔ لڑکے اس کے انتظار میں سائیکل اسٹینڈ پر اپنی سائیکلوں میں سے ہوا نکلتے بھرتے رہتے۔ وہ صرف گردن اوپر ابھار کر بغیر کسی طرف توجہ کئے ایک لطیف لاپرواہ مسکراہٹ کو اپنے لبوں کے خطوط پر پھیلا دیتی جیسے کہنا چاہتی ہے کہ وہ جانتی ہے یہ سب کچھ کیا ہے اور کس لئے ہے۔ جب وہ سنیچر کے روز سیالکوٹ جانے لگتی تو کئی منچلے نوجوان بھی اس گاڑی میں جا سوار ہوتے۔ کوئی ایک دو اسٹیشن پہلے کوئی ایک دو اسٹیشن بعد سے لوٹ آتا۔ ہر روز اس کے پاس درجنوں خطوط آتے۔ کوئی اپنی محبت اور عقیدت کا ثبوت دیتا، کوئی خودکشی کی دھمکی دیتا۔ کوئی اس کی محبت کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کی قسمیں کھاتا۔ کوئی لکھ بھیجتا کہ وہ صرف اس کی پرستش کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔ کوئی سینما کے پاس بھیج دیتا، کوئی اپنا فوٹو۔

ایک دن اس کی ایک کاپی جماعت کے کمرہ میں ہی رہ گئی۔ جب اسے وہ واپس ملی تو چالیس سے زائد لڑکوں نے اس میں دل کے نقشے کھینچ کر اپنے اپنے نام لکھ دیئے تھے۔ سیکڑوں شعر اور بڑی بڑی محبت کا لیاں لکھی ہوئی تھیں۔ اس میں ایک انچ جگہ بھی خالی نہیں تھی۔ اس لڑکی کا نام وینا تھا۔ ہر جگہ اس کے نام کے پہلے لفظ "وی" کا نشان ہی نظر آتا تھا۔ بلیک بورڈوں پر، ڈیسکوں پر، دروازوں پر، رومالوں پر فاؤنٹین قلموں پر نئے عاشق مزاجوں نے اپنے نام سے پہلے یہ 'وی' لگالی تھی۔

وی محمد حسن، وی گوبند سنگھ، وی رام چندر۔

ان بیسواؤں کی لڑکیوں کے کانوں میں عموماً چھوٹی چھوٹی مرکیاں پڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ جو ان کی کنوارپنے کی نشانی ہوتی ہے۔ ایک دن ہماری جماعت کا ایک دن یہ خبر لایا کہ وینا کی بہن کی ان مرکیوں کو اتارنے کیلئے ریاست جموں کے ایک جاگیردار نے دس ہزار روپیہ خرچ کیا ہے۔ یہ خبر چند گھنٹوں میں ہی تمام کالج میں پھیل گئی۔ اور لڑکے وینا پر طرح طرح کے آوازے کسنے لگے۔ اس سے چھیڑ کرنے کیلئے لڑکے ویسے بھی کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈھ ہی لیا کرتے تھے۔ ایک لڑکا کالج سے نکال بھی دیا گیا۔ لیکن ان باتوں سے بھلا کون مانتا تھا۔ چند لڑکے اس کے ہوسٹل کی دیواریں پھاندنے کی کوشش میں پکڑے گئے تھے۔ کچھ اور لڑکوں نے اسے اغوا کرنے کی کوشش کی۔ اور انھیں چھ چھ مہینے جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ ایک دن ایک لڑکا جو وینا کا ہم جماعت تھا اور خود بھی کافی خوبصورت تھا۔ اس کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ اپنا سر اس کے پاؤں پر رکھ کر گڑگڑا کر محبت کی بھیک مانگنے لگا۔ اس لڑکے کو گھسیٹ کر علیحدہ کیا گیا۔ وہ زور زور سے رونے اور چیخنے لگا۔ چند دن وہ بہکا بہکا پھرتا رہا۔ پھر دو دن وہ بالکل غائب رہا۔ تیسرے دن راوی کے کنارے اس کے کپڑے ملے۔ ان میں یہ لکھا ہوا ملا کہ "اس موت سے ڈوب مرنا بہتر ہے۔ اپنے جسم کو پتھر باندھ کر تاکہ لاش بھی نہ ملے۔"

میرے دل میں وینا محبت کی بجائے ایک مبہم سی نفرت پیدا کر سکی تھی۔ ایک دن بازار میں میں پیدل جا رہا تھا۔ وہ میرے پاس سے گذر رہی تھی کہ اسکی سائیکل کی زنجیر نکل گئی۔ میں نے جلدی سے لپک کر اسے ٹھیک کیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی جیسے کہہ رہی ہو کہ میں جانتی تھی کہ تم ایسا کرنے کیلئے بھاگے بھاگے آؤ گے میں جانتی تھی ـــــــ میں از حد شرمسار ہو گیا۔ میں اپنی کتابیں کسی کو نہیں دیا

کرتا تھا۔ ایک دن وینا آکر مجھ سے ایک کتاب مانگنے لگی۔ میں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کر وہ کتاب نکال کر اسے دیدی۔ اور وہ پھر اپنے اسی مخصوص انداز میں مسکرانے لگی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ میں جانتی تھی کہ تم انکار نہیں کر سکتے۔ شرم سے میں پانی پانی ہو گیا۔ غصّہ سے میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ اور ایک اضطراری کپکپی مجھ پر طاری ہو گئی۔

دینا کی خوبصورتی میرے لئے کشش کا باعث نہیں ہو سکی تھی۔ جس سے محبت کرنے کی بجائے میں اس پر فلسفہ چھانٹ سکتا تھا۔ میرے دل میں وہ ان حسیات کو بیدار نہیں کر سکی تھی جو عموماً ایک عورت مرد کے دل میں کرتی ہے۔ میرے لئے یہ چیزیں ان دنوں اتنی ہی غیر ضروری تھیں جتنی تیسری ٹانگ۔ بلکہ میں اس بات پر غور کیا کرتا تھا کہ اتنی خوبصورتی کے ساتھ جینا کسی کے لئے کتنا مشکل ہو گا۔ اور یہ حسن عورتوں کو کہیں سزا ہی تو نہیں ملی۔ ہر وقت یہ انھیں آئینہ کی طرف ہی کھینچے رکھتا ہو اور انھیں مجبور کرتا ہے کہ وہ ہر ایک آدمی کی آنکھوں میں بھی ایک آئینہ کی طرح ہی دیکھتی رہیں۔ اور ان میں اپنے حسین ہونے کا ثبوت تلاش کرتی پھریں۔ میرے دل میں یہ خیال رہ رہ کر کھٹکا کرتا تھا کہ خدا نے اس حُسن کو مرد اور عورت دونوں کی زندگی اُجیرن بنانے کیلئے پیدا کیا ہے۔ ورنہ اس کی ضرورت ہی کیا تھی جبکہ آدمی عورت کے پاس صرف ان جذبات کے زیر اثر جاتا ہے جو ایک حیوان کو دوسرے حیوان کی طرف کھینچتے ہیں۔"

یہ کہہ کر پروفیسر مجھر ذرا رُک گیا۔ اس کا سر کندھوں میں ڈوب گیا تھا۔ وہ اپنی ناک پر سے آہستہ سے عینک اتار کر اس کے شیشوں کو رومال سے صاف کرنے لگا۔ اس کے جذباتی حیرت انگیز چہرے پر موٹی مدھم سُرخ ڈوروں بھری آنکھیں سوجے ہوئے پپوٹوں کے نیلے تکیوں پر اُبھری ہوئی تھیں۔ اور لمبے لمبے کھچڑی بھروٹوں سے چھپی ہوئی تھیں۔ وہ ایک لمبے قد کا انسان تھا اور سوکھ کر کسی خزاں رسیدہ

درخت کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اس کی لمبی لمبی حنیدہ انگلیاں بڑے بے بس اور غیر ارادی طور پر کانپ رہی تھیں ۔ وہ میری طرف ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اسے نیند سے ابھی جگایا گیا ہے ۔ اس نے انگلی سے ماتھے پر سے پسینہ کی بوندوں کو پونچھا اور سوچنے کی کوشش میں بھرولوں کو سکیڑتے ہوئے اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"وہ دن سول نافرمانی کے دن تھے ۔ ہر روز لاہور میں پکٹنگ، ہڑتالیں، گرفتاریاں ہوتیں ۔ سب کالج بند ہو جاتے لیکن ہمارا کالج کھلا رہتا ۔ کیونکہ اس میں سب ٹوڈیوں کے لڑکے ہی پڑھتے تھے ۔ ایک دن لاہور میں عورتوں کے جلوس پر لاٹھیوں کی خوب بارش ہوئی ۔ اور بعد میں پولیس نے گولی بھی چلائی ۔ اگلے دن سارے شہر میں بطور احتجاج ہڑتال تھی ۔ تمام کالج بند تھے لیکن ہمارا بدستور کھلا تھا ۔ یکایک دنیا میں ایک تبدیلی رونما ہو گئی ۔ وہ اس ہڑتال کے روز کالج پر پکٹنگ کر رہی تھی ۔ ہمارے کالج میں بھی مکمل ہڑتال رہی ۔ اس کے بعد وہ کھدر پہن کر آنے لگی ۔ کالج کے بیشتر لڑکوں نے اس کی تقلید کی ۔ وہ اب تمام جلسوں اور جلوسوں میں حصّہ لینے لگی ۔ اس نے اپنی ماں کے پاس سیالکوٹ جانا بند کر دیا تھا اور وہ کالج چھوڑ کر موری دروازہ کے باہر والے والنٹیر عورتوں کے کیمپ میں جا شامل ہوئی تھی اور سول نافرمانی میں پورا پورا حصّہ لینے لگی تھی ۔

ان دنوں دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہو رہی تھیں ۔ وہ جلد ہی گرفتار ہو گئی اور ڈیڑھ سال کیلئے جیل بھیج دی گئی ۔ میرے دل میں اس کیلئے جو جذبۂ نفرت تھا وہ اب احترام میں تبدیل ہو چکا تھا ۔ میں اس کی زندگی میں اس معرکہ خیز تغیر پر حیران ہوا کرتا تھا ۔

ہمارے کالج میں لالہ بھاگ مل بھنڈر کا لڑکا رام سہائے پڑھا کرتا تھا ۔ وہ میرا ہم جماعت تھا اور وہ زنانہ جیل میں اپنی ماں سے ہفتے کے ہفتے ملنے جایا کرتا تھا ۔ وہاں

اس کی وینا سے بھی ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ ان کی جان پہچان ایک اچھی خاصی گہری دوستی کی شکل اختیار کرنے لگی۔ وینا اب بالکل ہی تبدیل ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو اپنے ماضی کے زمرہ سے قطعاً توڑ لیا تھا۔

گاندھی اروِن معاہدے پر جب سب رہا ہوئے تو وینا کو ایک نئی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اب اپنی ماں کی دستِ نگر نہیں ہونا چاہتی تھی۔ لاہور میں ایک یتیم لڑکیوں کا آشرم تھا۔ مل ملا کر لالہ بھاگی مل نے وینا کو اس کا انچارج بنوا دیا۔ وینا کالج میں پھر داخل ہو گئی۔ اور یتیم لڑکیوں کی خدمت کا کام بھی بڑی محنت اور عقیدت سے کرنے لگی۔ اس وقت تک وینا اور رام سہائے کی محبت بہت گہری اور پختہ ہو چکی تھی۔ آپس میں شادی کی باتیں ہونے لگیں۔ پہلے تو لالہ بھاگی مل نے اعتراض کیا۔ لیکن اصلاح پسند ہونے کی وجہ سے جلد ہی مان گئے۔ برادری کے ٹھیکیداروں نے بھی شور مچانے کی کوشش کی لیکن کیونکہ ٹکرا امیر آدمی سے تھی اس لئے جلد ہی خاموش ہو گئے۔ لالہ بھاگی مل کو اس سے سندر داماد سوشل بہو اور کہاں مل سکتی تھی۔

یتیم لڑکیوں کا آشرم گوالمنڈی کی ایک حویلی میں تھا۔ یک منزلہ حویلی جس میں بہت بڑا دالان تھا۔ اوپر لڑکیاں رہا کرتی تھیں اور نیچے استانیاں اور دوسری عورتیں۔ ایک رات اس حویلی کے ایک حصّے میں آگ لگ گئی۔ جب نیچے وینا اور دوسری عورتوں کی اوپر والی لڑکیوں اور بچیوں کی چیخوں سے آنکھ کھلی تو ساری بالائی منزل آگ کے بے قابو شعلوں میں دہک رہی تھی۔ بہت سی استانیوں نے باہر بھاگ کر اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔ وینا نے ایک عورت کو بیرونی امداد لانے کے لئے کہا اور خود ایک رسّہ لیکر آگ سے سلگتی ہوئی سیڑھیوں سے اوپر چڑھ گئی۔ اور اوپر والی لڑکیوں کو نیچے لٹکا کے اتارنے لگی۔ ابھی وہ تمام لڑکیوں کو

نیچے لٹکایا۔ اتنے میں وہ بالاخانہ جس پر وہ کھڑی تھی نیچے گر گیا۔ اور وینا آگ کے شعلوں میں لپٹی ہوئی دھڑام سے نیچے آگری۔ اور آگ سے جھلسے جانے کے علاوہ بری طرح زخمی بھی ہو گئی۔ اسے جلدی جلدی ہسپتال پہنچایا گیا۔

اگلے دن سارے شہر میں وینا کی بہادری اور قربانی کا چرچا تھا۔ اخباروں میں اس کے حسین چہرے کی تصویریں شائع ہوئیں۔ مرد عورتیں جوق در جوق اسے دیکھنے آتے۔ اس کا چہرہ اور بدن پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ میں بھی اسے ایک دفعہ اسے دیکھنے گیا۔ رام سہلائے تو دن رات وہاں بیٹھا رہتا اور اپنی محبت کے راگ الاپتا رہتا۔ باپ بیٹے دونوں کی فخر سے گردنیں اٹھ گئی تھیں۔ پاؤں زمین پر نہ ٹکتے تھے۔

اٹھارویں دن جب وینا کے چہرے پر سے پٹیاں کھولی گئیں تو ہم نے وہاں کسی اور ہی عورت کا چہرہ دیکھا۔ میں بھی وہیں تھا۔ سب کی گردنیں نیچے لٹک لٹک گئیں۔ وینا کا چہرہ بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ زخموں کے داغوں، آگ سے جھلسے جانے کے نشانوں اور جھائیوں نے اس کے چہرے کو از حد بد شکل اور گھناؤنا بنا دیا تھا۔ دائیں گال پر کھپرے سے ابھر آئے تھے جو نیچے گردن تک پھیلے ہوئے تھے۔ بایاں گال ایسا ہو گیا تھا جیسے مٹی پر کسی بچے نے انگلیوں سے لکیریں کھینچ دی ہوں۔ ناک بالکل جھلس چکی تھی۔ دائیں آنکھ بیٹھ گئی تھی۔ ہم سب پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔

وینا کے ہسپتال سے خارج ہونے میں ایک مہینہ اور باقی تھا۔ اس عرصہ میں رام سہلائے وہاں دو تین دفعہ اور آیا۔ پھر اس نے آنا بالکل بند کر دیا۔ یہ سب اتنا ناگہانی تھا کہ وینا کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ اسے تمام دنیا ہی میں تغیر سا محسوس ہو رہا تھا۔ جس دن وینا ہسپتال سے باہر نکلی اسی دن اس نے رام سہلائے کی کسی اور

لڑکی سے شادی کی خبر اخبار میں پڑھ لی۔

یتیم خانہ کی لڑکیاں جو پہلے دینا سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ اب اس سے بہت ڈرتی تھیں۔ اور اس کے قریب نہیں پھٹکتی تھیں۔ دینا نے اُن سے بہت پیار کیا۔ لیکن انھیں تو کسی اور ہی عورت سے محبت تھی۔ جلد ہی دینا کو اس نوکری سے بھی سبک دوش ہونا پڑا۔

دینا اب بالکل بے کس تھی۔ وہ اپنی ماں کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ اب وہاں جانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ اگرچہ اس کے کانوں میں ابھی تک مُرکیاں لٹک رہی تھیں ــــــــ! اس کے پاس اب ایک کوڑی بھی نہیں تھی۔ وہ اپنی تمام آمدنی کو یتیم خانہ کی لڑکیوں پر ہی خرچ کر دیا کرتی تھی۔ اس کی تمام پونجی اس حویلی کے ساتھ ہی جل کر راکھ ہو گئی تھی۔ وہ اپنے ایک دو گہنے فروخت کر کے گذارا کرنے لگی۔ اس نے چند اور جگہ ملازمت کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔

میں اُن دنوں اسی کالج میں لیکچرار ہو گیا تھا۔ میں نے گمنام طور پر دینا کو مالی امداد پہنچانے کی کوشش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بعد میں جب مجھ کو اس کی بیماری کی خبر ملی تو میں خود اس سے ملنے گیا۔ میرے دل میں اس کیلئے احترام کا جذبہ دن بدن بڑھتا گیا تھا۔

جب میں اس کے پاس پہونچا تو وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی۔ اس پر پڑی ہوئی چادر بالکل ہموار معلوم ہو رہی تھی۔ اور ایسا دکھائی دیتا تھا کہ ایک سوکھے ہوئے مریل سر کو تکیے پر اٹکا دیا گیا ہے۔ اس کے بخار سے دہکتے ہوئے چہرے کے سُرخ دھبے بڑے بھیانک طریقے سے چمک رہے تھے۔ آنکھیں بڑے دلگیر سایوں میں گھری ہوئی تھیں، جن سے اس کے مرجھائے ہوئے

چہرے کی ہڈیاں اور بھی ابھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ اس کی آنکھیں مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگیں۔ مرجھائی ہوئی دکھی مسکراہٹ اس کے دانتوں میں اٹک گئی۔ اس کی آنکھیں، ماتھے اور کنپٹیوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ بڑے ملال انگیز طریقے سے اس کا چہرہ غم کی وجہ سے اور بھی چپٹا اور لمبا معلوم ہونے لگا تھا اور انتہائی سنجیدہ اور مغموم عاجزی کی آئینہ داری کر رہا تھا۔

میں وینا کو اپنے ساتھ لے آیا اور وہ اس دن سے میرے ساتھ رہ رہی ہے۔ اس کے دل پر ماضی کی ان باتوں کا کچھ اتنا زیادہ اثر پڑ چکا ہے کہ وہ بہت مجبور کرنے پر بھی گھر سے باہر نہیں نکلتی۔ ابھی تک وہ اس صدمے سے اچھی طرح بحال نہیں ہوئی۔"

یہ سب کچھ پروفیسر سنجر نے بے رکے سنا دیا تھا۔ اور میں نے اسے انتہائی انہماک سے سنا تھا۔ چند ثانیوں کی اذیت خاموشی کے بعد اس نے مجھے پھر مخاطب کرتے ہوئے کہا: "ہم سب اس چہرے کی سفیدی اور بناوٹ کے مقابلہ میں اخلاقی و ذہنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کو ہیچ سمجھتے ہیں۔ ایسا کیوں؟" ——— یہ کیوں کا لفظ پروفیسر صاحب کے حلق سے چیخ کی طرح نکلا تھا۔ شدتِ احساس سے مجبور ہو کر اس نے اپنی گردن کو پیچھے کی طرف لٹکا دیا۔ میری آنکھوں کے کونے بھی آنسوؤں سے بھیگ گئے تھے۔

مکتبہ نشاط ۱۹۴۳ء

کتب مصنفہ عصمت چغتائی

کلیاں
عصمت چغتائی نے طنز نگاری میں ایک نئی شاہراہ خیال اختیار کی ہے جو نہایت دلکش اور حد درجہ موثر ہے "کلیاں" عصمت چغتائی کے سولہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین ملک کے مشہور رسائل میں شائع ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں سرورق رنگین۔ کتابت و طباعت عمدہ ضخامت ۲۲۵ صفحے۔ قیمت عہ محصول ۲ر

چوٹیں
عصمت چغتائی نے ایک خاص طبقے کی نوعمر لڑکی کی نفسیاتی زندگی کا کامیاب فوٹو اتارا ہے۔ ان کی کھوکھلی بیکار زندگی ان کے جھوٹے آنسو اور بے مقصد قہقہے ان کے برف جیسے دل اور پتھر سے دماغ دیکھ کر ہول آتا ہے۔ عصمت صاحبہ کہانیوں کے نیلے پیلے غبارے اڑانے کے علاوہ نہایت جاندار مضمون بھی لکھ سکتی ہیں (پروفیسر فیض احمد)
عصمت چغتائی کے سولہ مضامین کا مجموعہ "کلیاں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اب ۱۵ جدید مضامین کا دوسرا مجموعہ "چوٹیں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب کاغذ سفید دبیز، جلد مضبوط اور سرورق نہایت جاذب نظر ہے۔ قیمت عہ محصول ۲ر

ضدی
عصمت چغتائی کا مختصر ناول جس کا ہر کردار زندگی کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے اونچے طبقے کی رنگ رلیاں، نچلے طبقے کی افلاس زدہ زندگی، اور پھر دونوں طبقوں کی آویزش حسن و عشق کے ذریعے۔ ضدی پورن کی داستان عشق پڑھ کر آپ سابق شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کے رومان کو بھول جائیں گے۔ ضخامت ۱۱۲ صفحے۔ مجلد مع دلکش گرد پوش سے آراستہ۔ قیمت صرف ایک روپیہ محصول علاوہ۔

ملنے کا پتہ: ساقی بک ڈپو دہلی

کتب مصنفہ سعادت حسن منٹو

دھواں اردو کے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے چوبیس ولاویز افسانوں کا مجموعہ۔ منٹو جدت طراز اور بیباک ہے اور اس کے افسانے ایسے مشاہدوں کے مرقعے ہیں جو کسی اور افسانہ نگار نے آج تک پیش نہیں کئے۔ مجلد اور خوبصورت گردپوش عہ

جنازے دنیا کی مشہور ترین ہستیوں کو جب موت نے دبوچ لیا تو انھوں نے کیا کیا اور کیا کہا؟ اس سوال کا جواب آپ کو منٹو کی اس کتاب میں ملے گا جس میں چنگیز، تیمور، شاہجہاں، قلوپطرہ، ٹیپو، راسپوٹین، نپولین وغیرہ کے وقت آخر کے قلمی مرقعے پیش کئے گئے ہیں مجلد اور خوبصورت گردپوش سے آراستہ قیمت ایک روپیہ۔

اوپندر ناتھ اشک کی تصانیف

ستاروں کے کھیل اڈیٹر "ادبی دنیا" کے قول کے مطابق اشک ایک ایسا فن کار ہے جو اپنے مشاہدے کا چاک گھمائے جاتا ہے اور بڑی آسانی سے اس پر سے ایسے نازک اور سڈول کوزے اتارے جاتا ہے جو اپنی نزاکت میں افرنگ کی صراحیوں کو مات کرتے ہیں" کتابت وطباعت عمدہ مضبوط جلد رنگین گردپوش سے آراستہ۔ قیمت دو روپے محصول علاوہ۔

قفس اشک کے تیرہ منتخب افسانوں کا مجموعہ۔ اشک نے سیکڑوں افسانے لکھے ہیں لیکن یہ تیرہ افسانے ان کے بہترین اور کرشن چندر کے انتخاب کردہ ہیں۔ مجلد اور دلکش سرورق سے آراستہ۔ قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ۔

ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی

شکست

ملک کے مشہور افسانہ نگار مسٹر کرشن چندر ایم۔ اے نے یہ ناول لکھا ہے۔ اس ناول سے اردو افسانہ نگاری میں ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ راشد الخیری اور پریم چند کے ساتھ اردو ناول نگاری نے بھی دم توڑ دیا تھا لیکن ہمیں مسٹر کرشن چندر کا شکرگذار ہونا چاہیے کہ انھوں نے اس جسد بے روح میں ایک تازہ و توانا روح پھونکی ہے "شکست" کے مطالعہ سے آپکو معلوم ہوگا کہ یہ ناول ہندوستان کی کُل زبانوں کے عام ناولوں سے بالکل علیحدہ اور ممتاز ناول ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شکست کو یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں کے اعلیٰ ناولوں کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ ناول کا پس منظر جنت نظیر کشمیر ہے جس کے نام کے ساتھ ہی رومان کا سُہانا دُھندلکا ذہن پر چھا جاتا ہے۔ کرشن چندر نے اس سرزمین حُسن میں زندگی کے رومانی پھول کھلائے ہیں جب آپ اس ناول کو پڑھیں گے تو آپکو ایسا معلوم ہوگا کہ کسی جادوگر نے اپنی جادو کی چھڑی گھما کر آپکو اس عالم رنج و محن سے اٹھا کر سرزمین رنگ و نور میں پہنچا دیا ہے۔ وہاں کی رنگین دیہاتی فضا میں آپ سانس لیں گے اور وہاں کی مخلوق کے دکھ سکھ آپ کے اپنے دکھ سکھ بنجائینگے۔ کرشن چندر کا سحرکار قلم آپ کو ایک تماشائی نہیں بلکہ اپنے ناول ہی کا ایک جیتا جاگتا کردار بنا دیگا۔ اور جب وہاں کے میلے تماشوں، رسم و رواج حسین مناظر آپ دیکھیں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ آپ ان سب کا ایک جزو بن گئے ہیں۔ کتابت طباعت عمدہ مجلد گردپوش سے آراستہ ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت ۲

جزیرے مشہور افسانہ نگار محمد حسن عسکری ایم۔ اے کے آٹھ افسانوں کا مجموعہ عسکری صاحب نے اُردو افسانہ نگاری میں ایک جدید و لذیذ طرز بیان کا اضافہ کیا ہے۔ ان کا تخیل بیباک ہے۔ اور ان کا طریقہ اظہار بے لاگ۔ مندرجہ ذیل افسانے اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

(۱) کالج سے گھر تک (۲) پھسلن (۳) حرام جادی (۴) میلاد شریف (۵) چائے کی پیالی (۶) اندھیرے

کے پیچھے (۶) ایک معمولی خط (۷) وہ تین ۔ کتاب مجلد اور سرورق سے آراستہ قیمت عہ

ریزۂ مینا

رسالہ ساقی نے اردو افسانوی ادب میں ایک انقلاب عظیم کیا ہے ۔ آج اُردو کے افسانے دُنیا کی کسی زبان کے مقابلہ میں فخریہ پیش کئے جا سکتے ہیں ۔ رسالہ ساقی میں دس سال تک جتنے افسانے شائع ہوئے ہیں ان میں سے صرف پچاس بہترین افسانے شاھد احمد اڈیٹر ساقی نے انتخاب کئے ہیں ۔ یہ پچاس افسانے گویا ہزاروں افسانوں کا نچوڑ ہیں ۔ اور ان سے بہتر افسانے آپ کو کہیں بھی یکجا نہیں مل سکتے ۔ ان بے مثل پچاس افسانوں کے مجموعہ کا نام ریزۂ مینا ہے ۔ جس کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اب دوسرا ایڈیشن اور بھی آب و تاب سے شائع ہوا ہے ۔ نفیس مزاج افسانوں کے شائقین کیلئے ریزۂ مینا کا مطالعہ ناگزیر ہے ۔ اردو تاریخ افسانہ میں ریزۂ مینا ایک سنگ میل ہے ۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بغیر کوئی بھی صاحب ذوق اپنی معلومات کو مکمل نہیں کہہ سکتا ۔ کیونکہ ریزۂ مینا جدید اردو افسانہ کی تدریجی ترقی کی آئینہ دار ہے ۔ ساقی کی دس سال کی جلدیں نایاب ہو چکیں لیکن ان کے پندرہ ہزار صفحوں کا نچوڑ آپ کیلئے "ریزۂ مینا" کی شکل میں موجود ہے ۔ ضخامت ۵۰۰ صفحے ۔ کتابت و طباعت عمدہ ۔ مجلد ۔ سرورق آرٹ کا بہترین نمونہ ۔ بغیر "ریزۂ مینا" کے آپکی لائبریری نامکمل رہیگی ۔

قیمت تین روپے ۔ محصول ڈاک ۸ ر ۔

ساقی بک ڈپو دہلی

MUSLIM UNIVERSITY ALIGARH